قومی حکومت اور بیچاری قوم
ہفت روزہ
کراچی
معیار

ادارہ معیار کی ایک معیاری پیش کش
مستقبل کے پاکستان کے لئے
بچوں کے لئے
رنگا رنگ تصویروں، کارٹونوں، کہانیوں اور
سب دلچسپیوں سے معمور
بے شمار انعامی سلسلے
ٹوٹ
بٹوٹ
ہر مہینے
ہر بک سٹال پر دستیاب ہے
یا
براہ راست طلب کیجیئے
ماہنامہ ٹوٹ بٹوٹ : پوسٹ بکس نمبر ۳۱۹۵ : کراچی ۲۹

زیرِ اہتمام : یونائیٹڈ پبلی کیشنز لمیٹڈ

جلد ۳ ، شمارہ ۱۷ ، ۲۲ تا ۲۹ اپریل ۱۹۷۸ء

ایڈیٹر
محمود شام
ایگزیکٹو ایڈیٹر
اشرف شاد

شعبہ ادارت
عالمی امور — رفیع احمد نعمانی
ملکی امور — مجاہد بریلوی
شہناز احمد

نمائندے
حیدرآباد — حسن کامران
اسلام آباد — ضمیر نفیس
لاہور — خیکاف
پشاور — ثناء اللہ
مظفر آباد — جی ایم مفتی
ملتان — قسور سعید مرزا
فیصل آباد — خالد عباس سیف
کوئٹہ — چشتی مجاہد

قیمت ۳ روپے

بذریعہ ہوائی ڈاک

پاکستان میں بذریعہ معمولی ڈاک
قیمت فی کاپی ـــــ ۳ روپے
سالانہ ۵۲ شمارے ۱۴۰ روپے
ششماہی ۲۶ شمارے ۷۵ روپے

انگلستان ، ڈنمارک ، ناروے ، فرانس ، مغربی جرمنی ، سویڈن ، اٹلی ، سوئیزرلینڈ ، اسپین (یورپ) اور ایشیا میں :- جاپان ، ملائیشیا ، سنگاپور ، ہانگ کانگ ، چین ،
سالانہ ۵۲ شمارے ۳۸۰ روپے
ششماہی ۲۶ شمارے ۱۹۵ روپے

ایران ، عراق ، سعودی عرب ، کویت ، سری لنکا ، نیپال ،
سالانہ ۵۲ شمارے ۲۳۵ روپے
ششماہی ۲۶ شمارے ۱۲۳ روپے

ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کناڈا ،
سالانہ ۵۲ شمارے ۶۱۵ روپے
ششماہی ۲۶ شمارے ۳۱۵ روپے

آسٹریلیا ، نیوزی لینڈ ،
سالانہ ۵۲ شمارے ۵۴۵ روپے
ششماہی ۲۶ شمارے ۲۸۰ روپے

دوبئی ، ابوظہبی ، افغانستان ، بحرین ، مسقط ، قطر ، شارجہ ،
سالانہ ۵۲ شمارے ۲۶۵ روپے
ششماہی ۲۶ شمارے ۱۳۸ روپے

عالمی امور ، ملکی امور
معیشت ، کھیل ، تعلیم ،
فلم ، میڈیکل ، دفاع ،

خط و کتابت کے لئے پوسٹ بکس ۳۱۹۵ کراچی ۲۹ ، فون ۴۳۵۶۷۳

ایڈیٹر پبلشر محمود شام ، مطبع یونائیٹڈ پبلی کیشنز (پرنٹنگ ڈویژن) بلاک ۲ کراچی ، مقام اشاعت ۱۹۰-۱-سی ، بلاک ۲ ، پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹

اب الیکشن کا مطالبہ کیوں نہیں

میں اپنے بیان میں ان نام نہاد لیڈروں کی سخت مذمت کرتا ہے جنہوں نے قومی حکومت بنانے کے لئے گٹھ جوڑ کر کے اپنے جبلی خیالات کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں ان لیڈروں سے سوال کرتا ہوں کہ جناب آپ صاحبان آج کیوں خاموش ہیں جب ملک میں مارشل لاء ہے جب عوامی حکومت کا دور تھا، تو آپ بار بار الیکشن کا مطالبہ کرتے تھے آج ملک بھر میں غریب اور مسکین ہاریوں اور مزدوروں پر ظلم ہو رہا ہے، آپ صاحبان خاموشی سے دیکھ رہے ہیں۔

(عبدالحفیظ کاچھیلو، جیمس آباد، تھرپارکر)

عبدالغفور بھرگڑی کی وضاحت

معیار کے ۱۵ تا ۲۲ اپریل کے شمارے میں آپ کے نمائندے نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے دورہ لاڑکانہ کے دوران ایک کھلے اجلاس میں شرکت کی۔ جہاں تک اس اجلاس میں شرکت کا تعلق ہے تو یہ کوئی سیاسی اجلاس نہ تھا اور نہ ہی میں کسی سیاسی جماعت کے کسی وفد کے ساتھ اجلاس میں شریک ہوا تھا یہ مکمل طور پر ایک کھلا اجلاس تھا جس میں پارٹی کے سرکردہ مقامی کارکنوں کی اجازت سے میں نے شرکت کی تھی۔ آپ کے رسالے میں میرے متعلق اس خبر کے چھپنے سے پارٹی میں میری پوزیشن مشکوک ہوگئی ہے۔

میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنی پارٹی اور قائد پر غیر متزلزل اعتماد رکھتا ہوں۔ میرا ماضی کا سیاسی کردار اس بات کا گواہ ہے اور میرا قائد بھی اس بات سے واقف ہے کہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی مجھے اپنی پارٹی اور قائد سے علیحدہ نہیں کر سکتی۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس وضاحت کو اپنے رسالے میں جگہ دیں گے تاکہ میرے بارے میں چھپنے والی خبر سے جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے اس کا ازالہ ہو سکے۔

(عبدالغفور بھرگڑی
ڈپٹی سکریٹری پیپلز پارٹی سندھ۔ لاڑکانہ)

بیرون ملک پاکستانیوں میں بے چینی

ملک میں دستیاب روزگار اتنا کم رہا ہے کہ گذشتہ سالوں میں ہزاروں لوگ جائز اور ناجائز طریقہ سے ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ اب موجودہ حکومت نے ایسے طریقے اختیار کئے اور ایسے قانون بنائے کہ ناجائز تو کیا اب تو جائز طریقہ سے جانا بھی ناممکن ہوگیا ہے۔ ناجائز جانے والے خطرہ مول لیکر اور ۵ یا ۱۰ ہزار روپے ایجنٹوں کو دیکر چلے جاتے تھے مگر اب جائز طریقے سے یہ حال ہے کہ ۵ یا ۸ سو روپے سے لیکر ہزار روپے سرکاری کارندوں کو دینے پر ورک پرمٹ، اجازت نامہ یا نوکری کا پروانہ ملتا ہے اور اسلام آباد جاکر دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ NOC لینے کے لئے نہ معلوم کتنی قباحتیں حائل ہیں مگر کوئی توجہ نہیں دے رہا۔

مشرق وسطیٰ کی عرب ریاستوں میں ہزاروں لوگ ناجائز طریقہ سے چلے گئے تھے۔ گذشتہ دور حکومت میں بھٹو صاحب نے عرب ریاستوں سے ایسے تعلقات استوار کئے کہ ہمارے ہزاروں بھائیوں کو ان ریاستوں میں رہنے کے حقوق مل گئے۔

مگر اب موجودہ دور حکومت کی نہ معلوم کیا پالیسی جاری ہے کہ عرب ریاستوں سے ہمارے پاکستانی نکالے جا رہے ہیں۔ پاکستانیوں کے لئے روزگار کے راستے محدود ہو گئے، جب کہ عرب ریاستوں میں روزگار کے لامحدود چانس موجود ہیں جہاں ہماری ملکی غلط پالیسی کی وجہ سے دوسرے ممالک کے لوگ جائیں گے۔

گویا اب ہزاروں افراد کو نہ تو ملک میں روزگار کے مواقع ہیں اور نہ باہر جانے کے۔ آخر حکومت چاہتی کیا ہے؟ موجودہ حکومت کی غیر ملکی پالیسی میں سرد لہر آئی ہوئی ہے۔

استدعا ہے کہ حکومت فراخدلی سے کام لے اور باہر جانے والے افراد کو زیادہ سے زیادہ مراعات اور سہولتیں عطا فرمائی جائیں اور غیر ملکی پالیسی درست کی جائے اس طرح غیر ممالک خاص طور پر مشرق وسطیٰ میں مقیم پاکستانیوں کی حالت کی طرف توجہ دی جائے اور عرب ریاستوں سے تعلقات اتنے استوار ہوں تاکہ وہ ہمارے پاکستانیوں کو نہ نکالیں۔

انگلستان میں پاکستانیوں کی آمد کے سلسلہ میں جو مہم جاری ہے حکومت پاکستان اس بارے میں مثبت قدم اٹھائے تاکہ وہاں مقیم پاکستانی اور انکے رشتہ داروں کی آمد کے سلسلے میں مشکلات اور رکاوٹیں نہ ہوں۔

امید ہے ارباب حکومت واضح پالیسی کا اعلان کر کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں افراد کو تسلی دلائے۔

(عبدالقدوس بلوچ۔ مستونگ)

55

11

خصوصی
رپورٹ

قومی تحویل میں لی گئی بیشتر صنعتوں کو

نجی ملکیت میں دینے کا فیصلہ؟

کراچی - انتہائی باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پہلی باقاعدہ منتخب شہری سیاسی حکومت نے جن بنیادی صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کے انقلابی اقدامات کئے تھے - موجودہ عبوری فوجی انتظامیہ نے کئی مہینے کے طویل غور وخوض اور مشوروں کے بعد ان صنعتوں میں سے بیشتر کو نجی ملکیت میں واپس دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس سلسلے میں ضروری فائلیں ان دنوں وزارت قانون کے متعلقہ شعبوں میں زیر غور ہیں -

تفصیلات کے مطابق صرف "ہیوی مشینری" کی کارپوریشن اور سٹیل ملز کارپوریشن حکومت کے زیر انتظام رہیں گی - دیگر بنیادی صنعتوں سے متعلق کارپوریشنیں ، بتدریج نجی مالکوں کے حوالے کردی جائیں گی ، جن میں کیمیکلز ، لائٹ انجینیئرنگ ، سیمنٹ ، آٹوموبائیل کی کارپوریشنیں بھی شامل ہیں - جن سابق نجی مالکان نے پچھلے دنوں اپنے سابق کارخانوں کے دورے بھی کئے ہیں - ان میں نیشنل موٹرز (سابقہ گندھارا موٹرز) - ہیکو (سابقہ بیکو) - عوامی آٹوز (سابقہ علی آٹوز) قابل ذکر ہیں۔

وزارت پیداوار کے سیکریٹری مسٹر ایس بی اعوان کی اس ہفتے سبکدوشی کو بھی متعلقہ حلقے اسی سلسلے کی ایک کڑی بتا رہے ہیں ، ان کی جگہ مسٹر مجید مفتی وزارت پیداوار کے سیکریٹری مقرر کیئے گئے ہیں ۔ صنعتوں اور پیداوار کے مشیر ریٹائرڈ لفٹننٹ جنرل حبیب اللہ اور مسٹر ایس بی اعوان کے درمیان ایک عرصے سے سرد جنگ جاری تھی -

قومی تحویل میں لی گئی صنعتوں کے کارکنوں میں ان خبروں سے کافی بے چینی پھیلی ہوئی ہے ، ان میں سے بعض اداروں کی یونینوں نے مارشل لاء حکام کو تار بھیج کر اپنی تشویش کا اظہار بھی کیا ہے - ∞

جاوید اقبال کا صفحہ

محمود شام

جو مصلحت اختیار کرے گا وہ ہم میں سے نہیں ہے

فوجی حکومت سے مذاکرات اور پیپلز پارٹی کا موقف

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے پہلی بار ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے بعد فرزندِ کراچی۔ کراچی رابطہ کمیٹی کے صدر اور پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکیٹو کمیٹی کے سیکرٹری (آفس سیکرٹری) بیرسٹر کمال اظفر نے اس ملاقات کا جواز یہ بتایا ہے کہ سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی نے طے کیا تھا کہ اگر فوجی حکومت سے ملاقات میں انتخابات ایجنڈے پر ہوں تو ملاقات کی جاسکتی ہے۔

اس کے لئے ایک فارسی کی ترکیب ہوتی ہے "عذر گناہ بد تر از گناہ"۔ قومی اتحاد کے رہنما بھی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے ملے ہیں لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ انتخابات ایجنڈے پر تھے بات تو قومی حکومت کی ہوئی ہے۔ پہلے تو یہ مسئلہ دریافت طلب ہے کہ جنرل صاحب نے جس طرح قومی اتحاد کے سربراہ کو مذاکرات کی دعوت بھیجی تھی۔ یا تحریکِ استقلال کے سربراہ کو دعوت ملی یا قیوم لیگ کے سربراہ کو۔ ویسی دعوت پیپلز پارٹی کے سربراہ کو یا قائم مقام سربراہ کو نہیں بھیجی گئی۔ اس لئے پیپلز پارٹی کے کسی وفد کا جانا ہی محلِ نظر ہے پھر یہ کہ اس کی قیادت پیپلز پارٹی سے نکالے ہوئے ایک صاحب کر رہے تھے۔ اس وفد میں ملک اختر بھی تھے۔ جو خود پارٹی چھوڑ چکے ہیں۔ وہ معرکہ آرا دھاندلی جو اس ملک میں سینکڑوں لوگوں کی شہادت کا سبب بنی اور ملک کو ایک سنگین بحران میں مبتلا کر گئی۔ اس کے اصل ہیرو ملک اختر ہی تھے۔ کمال اظفر صاحب کے ایک ساتھی نصر اللہ خٹک ہیں۔ جو بہت پہلے سے خاموش ہو گئے تھے۔ انہیں مارشل لاء حکام نے مارشل لاء ۱۲ کے تحت گیارہ نظر بندوں میں شامل کر کے کچھ اہمیت بخش دی تھی ورنہ وہ بے چارے پیپلز پارٹی میں اب کوئی مقام نہیں رکھتے۔ غوث بخش رئیسانی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ انہیں بھی مارشل لاء ۱۲ نے لیڈر بنا دیا عوام کی رائے تو اس وقت معلوم ہو جائے گی جب انہیں رائے ظاہر کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ پارٹی کی قائم مقام چیئرمین بیگم نصرت بھٹو نظر بند ہیں۔ سیکرٹری جنرل۔ ایڈیشنل سیکرٹری جنرل قائم مقام سیکرٹری جنرل سب جیلوں میں ہیں اس لئے پیپلز پارٹی کا سرکاری موقف تو سامنے نہیں آرہا ہے لیکن پیپلز پارٹی کے قائدین اور موجودہ انتظامیہ کے درمیان جو خط و کتابت ہوتی رہی ہے۔ اس سے پارٹی کا قطعی موقف سامنے آسکتا ہے۔

اکتوبر میں موجودہ انتخابات کے التواء کے بعد چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ایک خط کے ذریعے پارٹی کو مذاکرات کی دعوت دی تھی۔ ۱۳ اکتوبر کی تاریخ بھی اس سلسلے میں مقرر ہوئی تھی۔ ۹، اور ۱۰ اکتوبر کو ۹ گھنٹے تک جاری رہنے والے اجلاس میں مکمل غور و خوض کے بعد مجلسِ عاملہ نے جوابی خط کا جو متفقہ مسودہ تیار کیا تھا اس میں پارٹی نے تین بنیادی مطالبات کو مذاکرات کی شرط قرار دیا تھا (۱) تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے (۲) انتخابات کی تاریخ کا فی الفور اعلان کیا جائے (۳) کوڑوں کی سزا منسوخ کی جائے۔

حکومت کی طرف سے اس خط کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد دوسرا رابطہ ۳ فروری کو ہونے والی سیاستدانوں کی بریفنگ کے سلسلے میں ہوا۔ اس سلسلے میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے سیکرٹریٹ سے بیگم نصرت بھٹو، غلام مصطفےٰ جتوئی، صاحبزادہ فاروق علی اور میر افضل کو خطوط موصول ہوئے۔ ۳ فروری کو کراچی میں پارٹی کی مرکزی مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں غور و خوض کے بعد ایک متفقہ مراسلہ بھیجا گیا جس میں یہ موقف اختیار کر لیا گیا کہ سرکاری دعوت نامے میں انتخابات کا ذکر تک نہیں ہے۔ اس لئے اس میں شرکت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس خط میں زور دے کر کہا گیا تھا کہ سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اور مارشل لاء حکام کے درمیان کسی بھی گفتگو یا کانفرنس کا ایجنڈا بحالی جمہوریت کے سوال اور عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی ہونا چاہیئے اس کے بعد بھی سیاستدانوں کی بریفنگ ہوتی رہی پارٹی کے بعض افراد کو دعوت نامے ملتے رہے۔ لیکن پیپلز پارٹی کا موقف وہی رہا ہے۔

اس مرتبہ قومی حکومت کے قیام کے سلسلے میں پیپلز پارٹی کو تو باقاعدہ دعوت نامہ ملا ہی نہیں۔ دعوت نامہ پیپلز پارٹی سے ۵ سال کے لئے نکالے ہوئے مولانا کوثر نیازی کو ملا۔ مولانا کوثر نیازی کو ۲۸۔ فروری کو پارٹی کی قائم مقام چیئرمین بیگم نصرت بھٹو نے مرکزی مجلسِ عاملہ کے ارکان سے غیر رسمی مشوروں کے بعد نکال دیا تھا۔ یکم مارچ کو سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں نہ لگتیں تو مرکزی مجلسِ عاملہ قائم مقام چیئرمین کے اس فیصلے کی باقاعدہ توثیق بھی کر دیتی۔ قائم مقام چیئرمین نے مولانا کو پارٹی سے نکالتے وقت جن اسباب کو بیان کیا تھا، وہ واقعتہً ایسے تھے کہ ایک پارٹی کارکن پارٹی کے ڈسپلن کی خلاف ورزی کرے تو اس کے خلاف کارروائی ہونی ہی چاہیئے اب انہی خلاف ورزیوں کے مرتکب کمال اظفر۔ رئیسانی اور نصر اللہ خٹک ہوئے ہیں تو ظاہر ہے کہ سیاسی سرگرمیوں سے پابندی ہٹتے ہی یہ بھی اسی کارروائی کے مستحق ہوں گے جو ان کے وفد کے لیڈر مولانا کوثر نیازی کے خلاف ہوئی تھی۔

اصولوں کے لئے جدوجہد طویل بھی ہوتی ہے اور جانگسل بھی۔ اس میں حوصلے ہمت اور استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقتدار کے لئے شارٹ کٹ ڈھونڈتے

والے اس جدوجہد کے متحمل نہیں ہو سکتے پارٹی کے اس وفد میں کوئی بھی ایسا نہیں جس نے عوامی تحریک میں قربانیاں دی ہوں اس لئے ان کے اس کردار سے کسی کو شکوہ نہیں اور نہ تعجب ہے چیئرمین بھٹو بھی مصلحت کا راستہ اختیار کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے اور پارٹی کی قائم مقام چیئرمین کالونی ٹیکسٹائل ملز ملتان کے محنت کشوں سے خطاب کے دوران کہہ چکی ہیں۔ "لوگو سنو! جب تک دم میں دم ہے۔ جدوجہد جاری رکھیں گے۔ ہم میں سے جو شخص بھی مصلحت کا راستہ اختیار کرے گا۔ وہ ہم عوام میں سے سے نہیں ہے۔"

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اس ہفتے سعودی عرب کے دورے پر گئے تو انہیں یہ اعزاز حاصل ہوا کہ شاہ خالد بنفسِ نفیس ائیرپورٹ پر انہیں لینے آئے۔ اسے ان کے ساتھ جانے والے اخبار نویسوں اور مشیر مذہبی امور نے بہت بڑا تجربہ قرار دیا۔ واقعی یہ بہت عزت کی بات ہے کہ سعودی عرب کے فرمانروا نے ہمارے سربراہ حکومت کو یہ اعزاز بخشا۔ یہ اعزاز ظاہر ہے کہ کسی شخصیت کے لئے نہیں ہے۔ پاکستان کے لئے ہے۔ پاکستان اور سعودی عرب کے جو تعلقات رہے ہیں۔ وہ دو ملکوں کے نہیں بلکہ اسلام کے لئے قائم کی گئی ایک مملکت کے اسلام کے منبع کے لئے عقیدت کے تعلقات ہیں سعودی عرب نے ہمیشہ پاکستان کو یہ تکریم دی ہے اسلامی سربراہ کانفرنس کے سلسلے میں شاہ فیصل نے سابق وزیر اعظم بھٹو کی جتنی پذیرائی کی اور انہوں نے اس کانفرنس کے اخراجات جیسے خود برداشت کئے۔ وہ بھی سعودی عرب کی طرف سے پاکستان کے لئے ایک اعزاز ہی تھا۔

ملکوں کے درمیان تعلقات شخصیتوں کی بنا پر نہیں ہوتے۔ بلکہ معروضی حالات، عالمی نقشے پر رونما ہوتی تبدیلیوں کے اعتبار سے ہوتے ہیں۔ عالمِ اسلام کے درمیان گذشتہ کئی برس سے جو مسلسل جدوجہد ہو رہی ہے وہ انتہائی مثالی ہے۔ اور اس کے اثرات بھی ظاہر ہوئے ہیں۔ لیکن عالم اسلام کے درمیان اتحاد کی کوششوں کو سامراج اور سامراج کے ایجنٹ سبوتاژ کرتے کے درپے ہیں۔ عالم اسلام کے لئے ہمہ تن جدوجہد کرنے والی شخصیتوں کو سیاسی پس منظر سے ہٹانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ جسمانی طور پر انہیں ختم کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔

عالم اسلام کو متحد ہو کر ان کوششوں کا جواب دینا ہے۔ سعودی عرب کو عالم اسلام میں ہمیشہ کی طرح اہم کردار ادا کرنا ہے۔ اسلامی قوت کو ایک مضبوط دفاعی اور سائنسی قوت بنانا چاہیئے۔ اسلام اب حرف شرعی تعزیرات تک محدود ہو جانے کا نام نہیں ہے۔ اسلام کو آج جن قوتوں سے مقابلہ درپیش ہے۔ وہ ہر طرح سے لیس ہیں۔ اور وہ ہر محاذ پر مسلمانوں کو پسماندہ رکھنے کی سازشیں کر رہی ہیں۔ پاکستان کو ری پراسیسنگ پلانٹ سے محروم رکھنے کے پس منظر میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔ پاکستان کو سفارتی سطح پر ایک فعال کردار ادا کرنے سے روکنے کے لئے بھی یہی سامراجی منصوبے پوشیدہ ہیں۔

سعودی عرب کے فرمانروا نے ہمیں جو عزت بخشی ہے۔ اب ہمیں خود بھی اس عزت کا مستحق ثابت کرنا ہے سعودی عرب میں اگرچہ جمہوریت نہیں ہے۔ بادشاہت ہے۔ لیکن وہاں لوگوں کے حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ قدرت نے سعودی عرب کو تیل کی دولت سے مالامال کیا ہے۔ اس لئے وہاں معاشی مسائل نہیں ہیں، صرف منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ وہاں شرعی سزائیں ہیں، لیکن وہاں کے معاشی اور معاشرتی حالات ایسے ہیں کہ وہ جرائم کا محرک نہیں بنتے۔ ہمارے ہاں تیل کی دولت نہیں ہے۔ معاشی ناانصافی ہے۔ معاشرتی حالات بدترین ہیں۔ یہاں جرائم روکنے کے لئے شرعی سزاؤں سے پہلے یا ان کے ساتھ ساتھ معاشی عدم توازن دور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسے حالات پیدا کرنے کی ضرورت ہے جن سے معاشرے میں جرائم کا امکان ہی پیدا نہ رہے۔ اندرونی معاملات پر خود ایک ملک کے عوام کو ہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے کسی دوسرے ملک سے ان کی سند نہیں لی جاسکتی۔ ہم اس بات پر مطمئن ہو کر اپنی منصفانہ جدوجہد نہیں چھوڑ سکتے۔ کہ شاہ خالد نے ہمارے سربراہ حکومت کا خود استقبال کیا ہے۔ اس لئے اسلام کے مکمل نفاذ اور معاشرے میں ناانصافی دور کرنے کے لئے ہمیں جو جدوجہد کرنا ہے۔ ہم اس سے دستکش ہو جائیں۔

"مسٹر عطاء الرحمان نے ایک بیان میں کہا ہے کہ قومی حکومت کے قیام کا امکان اب ختم ہو گیا ہے۔ مسٹر عطاء الرحمان قومی حکومت کے قیام کے سلسلے میں صدر ضیاء الرحمان کے لئے ہمدردی حاصل کرنے کی خاطر سیاسی رہنماؤں سے مذاکرات کر رہے تھے۔ انہوں نے الزام عائد کیا ہے کہ مارشل لاء کی حکومت قومی حکومت کے قیام کے لئے کبھی بھی سنجیدہ نہیں رہی اور وہ محض اقتدار قائم کرنے کے لئے" مذاکرات میں وقت ضائع کرتی رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مارشل لاء حکومت قوم پر صدارتی طرزِ حکومت ٹھونسنا چاہتی ہے جب کہ سیاسی رہنما پارلیمانی طرزِ حکومت کے حامی ہیں۔"

(روزنامہ جنگ کراچی ۱۸ اپریل ۱۹۷۸ء)

یہ حسنِ اتفاق ہی ہے کہ پاکستان کی طرح بنگلہ دیش میں بھی حکمران فوجی حکومت اور سیاسی رہنماؤں کو ملا کر ایک قومی حکومت کی تشکیل کی کوششیں کی جا رہی تھیں، لیکن سیاسی رہنماؤں کو اس میں شامل کرنے کی ترغیب دینے کا فرض جن صاحب یعنی بنگلہ دیش جاتیو لیگ کے سربراہ مسٹر عطاء الرحمان خان کے سر تھا انہوں نے اپنی کوشش کی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔ ساتھ ہی فوجی حکومت کے عزائم کے بارے میں اپنے شکوک و شبہات کا اظہار بھی کر دیا۔

پاکستان میں قومی حکومت کی تشکیل کی کوششیں ابھی اپنے عروج پر ہیں۔ یہاں سیاستدانوں کو اس مجوزہ قومی حکومت میں شرکت پر آمادہ کرنے والے سیاسی رہنما سردار قیوم ہیں جنہوں نے اس کے برعکس قومی حکومت کے بارے میں بڑے حوصلہ افزا بیانات دیئے ہیں ان کے تازہ ترین فرمودات یہ ہیں:۔

"چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور سیاسی

قومی حکومت بنے گی؟ نہیں بنے گی؟

آٹھ بڑی سیاسی جماعتوں میں سے صرف ۲ جماعتیں حکومت میں شمولیت کے لئے تیار ہیں

رہنماؤں کے مابین ہفتے کے روز ملاقات سے (میرے) مشن کا نوّے فیصد کام مکمل ہوگیا ہے جب کہ باقی حصّہ قومی قیادت کے اجتماعی طور پر قومی مسائل حل کرنے کے عزم صمیم، اسلامی بھائی چارے اور پاکستان کے قومی مفادات کو دوسرے تمام مفادات پر ترجیح دینے کے جذبہ کے تحت مکمل ہوجائے گا۔۔۔۔ (مجھ کو) یہ معلوم کرکے ازحد خوشی ہوئی کہ تمام قومی رہنما قومی مقاصد کے حصول کی خاطر مسلح افواج سے مکمل تعاون کرنے کے خواہاں ہیں۔"

(نوائے وقت لاہور - ۱۸ اپریل ۱۹۷۸ء)

سردار قیوم کا یہ مشن کیا تھا؟ اگر قومی حکومت کی تشکیل ان کا مشن تھا تو ان کے بیان سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ قومی حکومت کی تشکیل کا نوے فیصد کام مکمل ہوگیا ہے اور اگر وہ سیاسی رہنماؤں کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے ملوانے کو اپنے مشن کا نوّے فیصد حصّہ سمجھتے ہیں تو یہ بات بھی بڑی ناقابلِ فہم نظر آتی ہے کہ اس کے لئے انہیں اتنی زحمت دینے کی ضرورت قطعی نہیں ہے۔ سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے جنرل صاحب کی ملاقات کوئی انہونی واقعہ نہ تھا، مختلف مسائل اور بریفنگ کے لئے جناب ضیاء الحق سیاسی رہنماؤں کو پہلے بھی بلاتے رہے ہیں اور اس کے لئے کبھی سردار قیوم کے وسیلے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اگر سردار صاحب کا مشن قومی حکومت کی تجویز پر مخالفانہ طرزِ عمل اختیار کرنے والوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا تو اصغر خان اور جمعیت علمائے پاکستان پھر بھی جنرل صاحب سے ہونے والی اس ملاقات میں موجود نہیں تھے۔ صرف مزاری صاحب کو اس ملاقات پر آمادہ کرنے کو وہ نوّے فیصد کامیابی سے تعبیر کرتے ہیں تو اس کے معنی پھر یہ ہوں گے کہ وہ این ڈی پی کے مقابلے میں تحریک استقلال اور جمعیت علمائے پاکستان کو صرف دس فیصد قوت تصوّر کرتے ہیں۔

سردار قیوم نے اسی روز پی پی آئی کے ایک انٹرویو میں یہ بھی بشارت دے دی ہے کہ قومی حکومت بس اب قائم ہی ہونے والی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اصولی طور پر یہ سیاسی پارٹیاں قومی حکومت میں شرکت پر پہلے ہی رضامند ہو چکی ہیں اور اب یہ تفصیلات طے کی جا رہی کہ قومی حکومت میں شمولیت اختیار کس طرح کی جائے گی۔ ایک طرف سردار قیوم مستقبل قریب میں مجوزہ قومی حکومت کے قیام کی نوید دے رہے ہیں، بلکہ یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ ۲۸ر اپریل تک کوئی نہ کوئی ٹھوس بات سامنے آجائے گی"۔ جبکہ دوسری طرف قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل پروفیسر غفور ابھی تک بڑے محتاط طرزِ عمل کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور ان کی حالیہ گفتگو سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں قومی حکومت کے قیام کا کوئی امکان موجود نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے ملاقات میں قومی حکومت کا کوئی فارمولا پیش نہیں کیا گیا بلکہ صرف اس کے امکان پر بات ہوتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے دوبارہ

کوثر نیازی کی شمولیت مجوزہ قومی حکومت کا وقار اور کم کر دے گی

ملاقات کا کوئی وقت طے نہیں ہوا ہے، ابھی الیکشن سیل کے ارکان سے ملاقات ہوگی۔ قومی اتحاد خود بیٹھ کر غور و خوض کرے گا، پھر کہیں کوئی فائنل بات ہوگی جس سے یہ مہینہ تو یونہی گذرتا محسوس ہوتا ہے۔

قومی اتحاد کے سربراہ مفتی محمود اپنے پرانے اتحادی سردار شیر باز مزاری کے ہمراہ پشاور میں پارٹی کے لیڈروں سے صلاح مشورہ کر رہے ہیں۔ مفتی محمود واضح طور پر کہہ چکے ہیں کہ کوثر نیازی گروپ کے ساتھ قومی حکومت میں شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب کہ کوثر نیازی خود کو مجوزہ قومی حکومت کا طے شدہ پرزہ سمجھے ہوئے ہیں۔ قومی اتحاد کے نائب صدر نوابزادہ نصراللہ خان اپنے اس اصولی موقف پر سختی کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں کہ انتخابات کے بغیر قومی حکومت کی تشکیل بے معنی ہے۔ تحریک استقلال کے سربراہ اصغر خان کا بھی یہی موقف ہے جس میں ابھی تک کسی تبدیلی کا اعلان نہیں آیا۔ جمعیت علمائے پاکستان اس پورے معاملے ہی سے بے تعلق ہوئی بیٹھی ہے۔ جماعت اسلامی کا ترجمان روزنامہ جسارت اپنے اداریے میں قومی حکومت کی تشکیل کو غیر اصولی قرار دے چکا ہے۔

اور بیچاری قوم ــ وہ حیران و پریشان اس سارے تماشے کو دیکھ رہی ہے کہ اس کے نام پر بنائی جانے والی حکومت ان کے بغیر کس طرح بن رہی ہے ہم نے اس وقت بھی جبکہ قومی حکومت کی تجویز سامنے آئی تھی یہ سوال اٹھایا تھا کہ آخر قومی حکومت بنائی کیوں جارہی ہے۔ قومی حکومت کہتے کسے ہیں اور صحیح معنوں میں قومی حکومت کی تعریف کیا ہے۔ اور آج بھی یہ سوال سب سے اہم ہے کہ مارشل لا حکام اور بعض سیاسی پارٹیوں کے باہم امتزاج سے جنم لینے والی حکومت قومی حکومت کہلانے کی مستحق بھی ہوگی یا نہیں۔ پروفیسر غفور صاحب کے مطابق جنرل ضیاء الحق صاحب نے قومی حکومت کی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا تھا "عوام کو جو مختلف مسائل درپیش ہیں اور مختلف سیاسی رہنما اور جماعتیں جن مسائل کی شکایت کرتی ہیں انہیں دور کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے، کیا موجودہ طرز حکومت ہی باقی رکھا جائے یا قومی حکومت قائم کی جائے اور اگر قومی حکومت قائم کی جائے تو اس کی صورت کیا ہو اور سیاسی جماعتیں اس سلسلے میں کس حد تک تعاون کریں گی۔" اس سے تو صرف یہ صورت سامنے آتی ہے کہ مارشل لاء حکومت مسائل کے حل کی ذمہ داری ان سیاستدانوں پر مشتمل قومی حکومت کو تفویض کرنا چاہتی ہے جو ان مسائل کی شکایات کرتے رہتے ہیں۔ اس سے مجوزہ قومی حکومت کی کوئی سیاسی شکل و شباہت کا اندازہ ممکن نہیں ہوتا، جبکہ عوام کے مسائل سیاسی بھی ہیں۔ سیاسی جماعتیں ابھی سے اس تجویز پر جس حد تک اختلاف رائے

کا شکار ہیں اور اس میں شرکت کے بارے میں انہوں نے جو بالکل مختلف شرائط رکھی ہیں ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اگر اپنے یہ تضادات دور کر کے ایک قومی حکومت کی شکل کا جمگھٹا بنانے میں کامیاب بھی ہو گئیں تو عوام کو درپیش مسائل پر کس قدر مختلف اپروچ کا مظاہرہ کریں گی۔

قومی حکومت کی صورت کیا ہو؟ اس بارے میں بھی قطعی مختلف باتیں سامنے آئی ہیں۔ پہلے قومی حکومت کی پیشگی شرط یہ رکھی گئی تھی کہ اس میں تمام سیاسی جماعتیں شریک ہوں۔ اس سلسلے میں پیپلز پارٹی کی کمی پوری کرنے کے لئے مولانا کوثر نیازی میدان میں آ بھی گئے تھے۔ لیکن بعد ازاں الیکشن سیل کے جناب جنرل فیض علی چشتی نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ ضروری نہیں سب جماعتیں مجوزہ قومی حکومت کی تشکیل دیں۔ پھر مولانا مفتی محمود نے بھی ایک طرف کوثر نیازی کی شمولیت کی مخالفت کی تو دوسری طرف یہ بھی فرمایا کہ قومی حکومت تحریک استقلال اور جمعیت علمائے پاکستان کے بغیر بھی بن سکتی ہے۔ اس طرح پیپلز پارٹی، تحریک اور جمعیت تو نکل گئیں دوسری طرف پی ڈی پی اور این ڈی پی خود شمولیت کے لئے تیار نہیں ہیں لہٰذا جب قومی حکومت کا تصور مولانا مفتی محمود اینڈ پارٹی کے ذہن میں ہے، وہ اصلی قومی اتحاد کے ایک تہائی حصے پر مشتمل ہوگی اور اس طرح یہ قومی حکومت جمعیت علمائے اسلام، مسلم لیگ، جماعت اسلامی کی مخلوط (کولیشن) حکومت بن کر رہ جائے گی۔ جب کہ مسلم جمہوری کشمیر کانفرنس اور خاکسار تحریک بھی خانہ پری کے لئے شاید اس میں جمع کر دی جائیں۔ پاکستان کی آٹھ بڑی سیاسی جماعتوں میں سے صرف تین جماعتوں پر مشتمل یہ حکومت جسے قومی حکومت کا نام بھی دے دیا جائے تو ایک ایسی کمزور ترین حکومت ہوگی جس کا حشر ۱۹۵۸ء سے پہلے کے دور میں روز بننے اور ٹوٹنے والی حکومتوں سے بھی برا ہوگا۔ اس میں زیادہ سے زیادہ اضافہ این ڈی پی کا ہو سکتا ہے، جسے مفتی محمود قومی حکومت میں شامل ہونے پر رضامند کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ یا پھر مولانا کوثر نیازی پیپلز پارٹی سے نکالے ہوئے یا بدعنوان قرار پائے گئے سیاستدانوں کی ٹولی لے کر اس میں شامل ہو سکتے ہیں اور ان کا یہ اضافہ بھی اس حکومت کا وقار بڑھانے کے بجائے اور کم کر دے گا۔

اس ساری صورت حال سے مجوزہ قومی حکومت کا مستقبل زیادہ خوش آئند نظر نہیں آتا۔ اور لگتا ہے کہ سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں کی اپروچ کے اختلاف کے پیش نظر جنرل ضیاء الحق اور ان کی حکومت کو ذمہ داریوں کا یہ بوجھ تنہا ہی اٹھانا پڑے گا۔

ایم احمد

ملک قاسم صرف بیگم بھٹو کو پیپلز پارٹی کا سربراہ کہتے ھیں،

تحریکِ استقلال میں حکومت سے آئندہ مذاکرات نہ کرنے پر غور و خوض

قومی حکومت کے مسئلے پر مذاکرات کے لئے راولپنڈی جانے سے قبل مسلم لیگی رہنماؤں کا ایک اہم اجلاس چودھری ظہور الٰہی کی قیام گاہ پر منعقد ہوا جہاں انہوں نے مسلم لیگی رہنماؤں کے اعزاز میں ایک عشائیے کا انتظام کیا تھا اجلاس میں پیر صاحب آف پگارا شریف نے قومی حکومت کے قیام کے لئے جنرل ضیاء الحق سے راولپنڈی میں ہونے والے مذاکرات کی بابت مسلم لیگی رہنماؤں کو اظہار خیال کی دعوت دی۔ مسلم لیگ کے سکریٹری جنرل ملک محمد قاسم نے واضح طور پر کہا کہ مسلم لیگ کو اسی صورت میں قومی حکومت میں شمولیت اختیار کرنی چاہیئے جبکہ قومی حکومت میں ملک کی تمام بڑی سیاسی جماعتیں شرکت کریں اور قومی حکومت کے قیام کا مقصد صرف ملک میں فوج اور عدلیہ کی نگرانی میں عام انتخابات کا انعقاد ہو۔ انہوں نے مسلم لیگی رہنماؤں کو مشورہ دیا کہ وہ مولانا کوثر نیازی کی قیادت میں قائم ہونے والی قومی حکومت میں شرکت کی مخالفت کریں۔ بعد میں انہوں نے بعض اخبار نویسوں سے غیر رسمی بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ وہ صرف بیگم نصرت بھٹو کی جماعت کو ہی پیپلز پارٹی تسلیم کرتے ہیں۔

ملک قاسم نے کہا اس مسئلے پر مسلم لیگ کے کارکن جو رائے رکھتے ہیں، انہوں نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے اجلاس کے شرکاء کو کارکنوں کی رائے سے آگاہ کر دیا ہے۔ اجلاس میں چودھری ظہور الٰہی نے مولانا کوثر نیازی سے اپنے مذاکرات کی تفصیلات بیان کیں۔

قومی اتحاد میں شامل پاکستان جمہوری پارٹی کے سربراہ نوابزادہ نصر اللہ خان بھی قومی حکومت کے مسئلے پر مسلم لیگی رہنماؤں اور جماعت اسلامی کے موقف سے اختلاف رکھتے ہیں یہی وجہ تھی کہ اس بار مذاکرات میں شرکت کے لئے وہ خود راولپنڈی نہیں گئے اور ان کی جماعت کی نمائندگی جمہوری پارٹی کے جنرل سیکریٹری رانا ظفر اللہ نے کی۔ جمہوری پارٹی کے ایک رہنما مسٹر حکم قریشی صدر ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن نے ایک غیر بات چیت میں یہاں تک کہہ دیا کہ اگر ان کی جماعت ان حالات میں قومی حکومت میں شامل ہوئی تو وہ جمہوری پارٹی سے مستعفی ہو جائیں گے۔ قومی اتحاد کے ایک لیڈر اور خاکسار تحریک کے سربراہ اشرف خان جو کہ پچھلے دنوں لاہور میں موجود تھے۔ انہوں نے بھی قومی حکومت میں پیپلز پارٹی کے لبرل گروپ کی شمولیت کی شدید مخالفت کی اور اس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک اخباری بیان

جمعیت علمائے پاکستان مفتی محمود کو قومی اتحاد کے آئین کا پابند بنانے کی جدوجہد میں مصروف ھے

مولانا کوثر نیازی اب قومی اتحاد کے لئے مسئلہ بن گئے ہیں

کے ذریعے بھی کیا، معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے بھی احتجاجاً راولپنڈی مذاکرات میں شرکت سے انکار کر دیا، جس پر مولانا مفتی محمود نے خاکسار تحریک کے ایک رہنما اسحاق ظفر کو خصوصی پیامبر کے ذریعے راولپنڈی بلوایا اور انہیں مذاکراتی ٹیم میں خاکسار تحریک کی نمائندگی کے لئے اپنے ہمراہ لے گئے۔

تحریکِ استقلال کے رہنما جو مشیر احمد پیش امام کی قیادت میں مذاکرات کے لئے راولپنڈی گئے تھے، ان کے ساتھ راولپنڈی میں جو کچھ ہوا اور جس طریقہ سے انہیں راولپنڈی سے مایوس واپس لوٹنا پڑا اس بات کا تحریک کے کارکنوں اور رہنماؤں نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ وفد میں شامل ایک رکن اور سابق وفاقی وزیر قانون محمود علی قصوری جب واپس لاہور پہنچے تو تحریک استقلال کے کارکنوں اور لاہور میں موجود رہنماؤں نے میاں محمود علی قصوری کو اپنے جذبات سے آگاہ کیا اور ان سے درخواست کی کہ ان کے جذبات سے ایئر مارشل اصغر خاں کو آگاہ کر دیا جائے۔ انہوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ جس طریقہ سے تحریک استقلال کے وفد کو راولپنڈی سے واپس بھیجا گیا ہے وہ تحریک استقلال کے لئے نیک فال نہیں ہے۔ اس لئے تحریکِ استقلال کو یہ فیصلہ کرا لینا چاہیئے کہ وہ آئندہ حکومت سے مذاکرات نہ کرے ان کارکنوں اور رہنماؤں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ تحریک استقلال کو فوری طور پر ملک میں عام انتخابات منعقد کرانے کا مطالبہ کرنا چاہیئے۔

قومی اتحاد اور جمعیت علمائے پاکستان کے درمیان قومی حکومت کے معاملہ پر مذاکرات کے مسئلہ پر اب مزید شدت پیدا ہو گئی ہے۔ جمعیت علمائے پاکستان پنجاب کے جنرل سیکرٹری ملک اکبر ساقی نے مولانا مفتی محمود کے اس بیان پر کہ "جمعیت علمائے پاکستان نے انہیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ انہیں مذاکرات کے لئے شمولیت کی دعوت دیں،" تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی جماعت قومی اتحاد کو کسی فرد یا گروہ کا آلۂ کار نہیں بننے دے گی کیونکہ قومی اتحاد کی تشکیل کا سہرا جمعیت علمائے پاکستان کے سر ہے۔ قومی اتحاد کے قیام کے وقت جب تمام لیڈر مایوس ہو کر واپس جا رہے تھے اس وقت مولانا عبدالستار نیازی کی ذاتی کوششوں سے جماعتی سربراہ مفتی محمود کو قومی اتحاد کے صدر بنائے جانے پر متفق ہوئے تھے، انہوں نے بتایا کہ اس موقع پر مولانا عبدالستار نیازی نے باقی جماعتوں کے سربراہوں کو مولانا مفتی محمود کی ماضی کی غلطیوں کو معاف کر دینے کا مشورہ دے کر تمام سربراہوں کو ان پر متفق کیا تھا انہوں نے کہا کہ جمعیت کے رہنما مفتی محمود اینڈ کمپنی کی سازشوں اور دھاندلیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے انہیں آئین قومی اتحاد کا پابند بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔

اقدام قتل کے ملزم
جنرل ٹکا خان
کی آمد پر
سخت حفاظتی اقدامات

پاکستان پیپلز پارٹی کے ایڈیشنل سیکریٹری جنرل اور سابق چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل ٹکا خان کے خلاف لاہور پولیس نے اقدام قتل، بلوہ اور مارشل لاء کے ضابطوں اور احکامات ۳۳، ۱۰، ۹ اور ۳ کے تحت مقدمات درج کر رکھے ہیں۔ اسسٹنٹ کمشنر لاہور سٹی کی عدالت میں درخواست ضمانت کی سماعت ہوئی۔ جنرل ٹکا خان کی درخواست کی سماعت جمعہ کے روز کی گئی جس دن تمام عدالتیں بند ہوتی ہیں، اسسٹنٹ کمشنر سٹی کو اس درخواست کی سماعت کرنی تھی اور وہ اپنی عدالت چھوڑ کر الصبح اسسٹنٹ کمشنر کینٹ کی عدالت میں پہنچ گئے جہاں جنرل ٹکا خان کو بذریعہ پی آئی اے پی ڈبلیو ڈی ریسٹ ہاؤس مری سے جہاں وہ آجکل مقید ہیں لاہور لایا گیا۔ کمرہ عدالت کے باہر چھٹی کے باوجود سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے تھے۔ فاضل عدالت نے پولیس کی درخواست پر جنرل ٹکا خان کا مزید دس روز کا جوڈیشنل ریمانڈ دینے کے بعد عدالت برخواست کر دی گئی۔

پیپلز پارٹی کے رہنما اس روز بہت خوشگوار موڈ میں تھے انہوں نے اپنی وکلاء راجہ محمد انور اور راجہ محمود اختر سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ پیپلز پارٹی پر اس وقت کڑی آزمائش کا دور ہے لیکن ہم لوگ اس آزمائش اور جدوجہد کے دور میں سرخرو ہو کر نکلیں گے۔ دوپہر ۱۲ بجے پی آئی اے کے ذریعے جنرل ٹکا خان کو واپس راولپنڈی بھیج دیا گیا۔

چشتی مُجاھد

خضدار میں معصوم بچے تشدد کا نشانہ کیوں بن گئے؟

کوئٹہ سے ایک سو بچانوے میل دور جنوب کی طرف سنگلاخ چٹانوں اور پہاڑوں سے گھری غیور بلوچوں کی سرزمین خضدار جب سے وجود میں آئی ہے اس بستی نے کئی انقلاب کئی جنگیں کئی حملہ آور اور کئی نیک دل اور مظلوم و جابر حکمران دیکھے ہیں مگر ہفتہ ۱۵۔ اپریل کی صبح اس شہر نے جو منظر دیکھا وہ آج تک دیکھنے میں نہیں آیا تھا خضدار کی جناح روڈ پر عظیم تاریخی قلعہ کے گیٹ کے سامنے ننھے منے معصوم بچے گر رہے تھے سسک رہے تھے تڑپ رہے تھے۔

۱۳۔ اپریل کو خضدار میں بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے سالانہ انتخابات منعقد ہوتے ہیں اس سلسلہ میں کوئٹہ سے بی ایس او کا ایک وفد سینئر نائب صدر محمد خان مینگل کی سرکردگی میں خضدار پہنچتا ہے لڑکے خضدار سے پندرہ میل دور باغبانہ کے مقام پر اپنے رہنماؤں کا شاندار استقبال کرتے ہیں نعرے بھی لگائے جاتے ہیں دوسرے دن شام کو خضدار کالج میں رسمِ حلف وفاداری کی تقریب اور بلوچی دیوان منعقد ہوتا ہے جس میں حکومت کے نقطۂ نظر سے قابل اعتراض تقاریر کی جاتی ہیں اور حکومت کے خلاف نعرے لگائے جاتے ہیں جس پر پولیس بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے سینئر وائس چیئرمین عبدالحمید خضدار کے صدر عبدالمجید حبیب اللہ بلوچ صوبائی خزانچی محمد عالم خضدار زون کے سابق صدر لطیف اور ورکنگ کمیٹی کے رکن محمد حنیف کو گرفتار کر لیتی ہے

دوسری صبح ۱۵۔ اپریل کو سکول اور کالج کے طلباء اپنے لیڈروں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کے طور پر ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کرتے ہیں ڈگری کالج خضدار کے چند طلباء ہائی سکول پہنچتے ہیں لڑکے سکول میں زبردستی چھٹی کرا دیتے ہیں اور ایک جلوس کی صورت میں کالونی روڈ سے ہوتے ہوئے خضدار بازار پہنچتے ہیں جہاں پاگل چوک میں جسے خضدار کا ہائیڈ پارک کہتے ہیں اور جہاں سے خضدار کے چار بازاروں مشکے روڈ مسجد روڈ جناح روڈ اور کراچی بازار کو راستے نکلتے ہیں ایک احتجاجی جلسہ منعقد ہوتا ہے جس سے طالب علم رہنما خطاب کرتے ہیں حکومت کے خلاف نعرے بھی لگائے جاتے ہیں اس کے بعد جلوس کے شرکاء جناح روڈ پر تاریخی قلعہ کا رُخ کرتے ہیں جس میں تھانہ جیل اور پولیس والوں کی بارکیں ہیں پولیس والے قلعہ کا دیوہیکل گیٹ بند کر لیتے ہیں طلبہ گیٹ کے باہر سڑک پر بیٹھ جاتے ہیں قلعہ کی چھت پر پولیس اور بلوچستان ریزرو پولیس کے سپاہی بندوقیں تانیں کھڑے ہیں جب کہ گیٹ کے سامنے بھی بندوقوں سے مسلح سپاہی کھڑے ہیں گیٹ ہی کے سامنے مجسٹریٹ ظریف خاں۔ بلوچستان ریزرو پولیس کے ڈی ایس پی شیخ محمد خاں اور خضدار تھانہ کے ایس ایچ او صفدر بھی کھڑے ہیں طالبعلم مسلسل نعرے لگا رہے ہیں ہمارے ساتھیوں کو رہا کرو۔ لاٹھی گولی کی سرکار نہیں چلے گی۔ اس وقت صبح کے ساڑھے نو بج رہے ہیں بیٹھے ہوئے لڑکوں میں سے ایک طالب علم آگے بڑھتا ہے اور ایک سپاہی کو چھیڑ کر بھاگتا ہے۔ شیخ محمد خاں اور صفدر آواز لگاتے ہیں "خبردار جانے نہ پائے"۔

ابھی یہ الفاظ ان کی زبان سے ادا ہوتے ہی نہیں کہ گولیاں چلنی شروع ہو جاتی ہیں قلعہ کے اوپر کھڑے اور نیچے کھڑے سپاہی معصوم بچوں پر فائرنگ شروع کر دیتے ہیں مجسٹریٹ ظریف خاں آوازیں لگا رہے ہیں خدا کے لئے گولیاں مت چلاؤ مگر ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوتی پولیس کے سپاہیوں کی آنکھوں میں نہ جانے کونسا خون اتر آیا تھا کہ جس نے انہیں اندھا کر دیا تھا دو منٹ بعد جب وہ ہوش میں آئے اور گولیوں کی بارش تھمی تو معصوم بچے خاک پر تڑپ رہے تھے تھوڑی دیر بعد ملیشیاء کے دستے پہنچ جاتے ہیں اور پورے شہر کو اپنے کنٹرول میں لے لیتے ہیں زخمیوں میں سے ایک زخمی اکبر ولد غلام حسین موقع پر ہی ہلاک ہو جاتا ہے پندرہ سالہ غریب مزدور اپنے بوڑھے والدین اور بہن بھائیوں کے کھانے پینے کے لئے چند پیسے کمانے نکلا تھا کہ ہمیشہ کے لئے محنت و مشقت کی مزدوری سے بچ گیا باقی پندرہ زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا جاتا ہے جن میں نو طالب علم چار مزدور ایک کسان اور ایک استاد شامل ہیں زخمی طالب علموں میں غلام محمد دوسری جماعت منظور احمد تیسری جماعت محمد امین پانچویں جماعت غلام نبی چھٹی جماعت محمد یٰسین رحمت اللہ عبدالقدیر (عبدالکبیر) آٹھویں جماعت۔ در محمد نویں جماعت اور محمد یوسف فسٹ ایئر کے طالب علم ہیں حبیب اللہ عبدالنبی اور غلام احمد غریب مزدور ہیں جو روزگار کی تلاش میں نکلے تھے کہ گولیوں کا نشانہ بن گئے ایک زخمی محمد علی بیچارہ اپنی دکان میں جوتے گانٹھ رہا تھا گولیوں کا نشانہ بننے والوں میں ایک استاد ثناء اللہ بھی شامل ہے۔ شہر میں معصوم بچوں پر فائرنگ کی خبر پورے شہر میں آگ کی طرح پھیل جاتی ہے پورے کا پورا شہر ہسپتال پہنچ جاتا ہے جسے ملیشیاء نے گھیر رکھا ہے اور کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہر شخص پریشان ہے بے قرار ہے کئی لوگ رو رہے ہیں خصوصاً عورتوں کی حالت دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے ہر شخص یہی سمجھ رہا ہے کہ شاید اُس کا بچہ زخمی ہے ہسپتال کے باہر معززین شہر۔ کالعدم نیپ کے رہنما آغا عبدالخالق۔ آغا عبدالظاہر۔ مجید۔ عالیجاہ غوث بخش مولانا ابوبکر غرض ہر شخص موجود تھا دوپہر ایک بجے کے قریب زخمیوں کے بارے میں پتہ چلتا ہے محمد امین عبدالکبیر اور محمد علی کی حالت نازک ہوتی جا رہی ہے چنانچہ انہیں ہیلی کوپٹروں کے ذریعے کوئٹہ کے سی ایم ایچ پہنچا دیا جاتا ہے غریب موچی محمد علی کے لئے خون کی ضرورت ہے تو بولان میڈیکل کالج کے جلیل اور اسحاق سمیت بیسیوں لوگ خون کے عطیے کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔

کمشنر قلات ڈویژن۔ شیخ ارشاد معززین شہر کو طلب کرتے ہیں شہریوں کا یہی مطالبہ ہے کہ شیخ محمد خاں

اور صفدر کو معطل کیا جائے اور گولیاں برسانے والے سپاہیوں کو لائن حاضر کیا جائے کمشنران کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کا مطالبہ ضرور پورا کیا جائے گا کمشنر معززین شہر کے ہمراہ اکبر مرحوم کے گھر جاتے ہیں اور دس ہزار کا عطیہ دیتے ہیں پولیس کی فائرنگ پر افسوس بھی کرتے ہیں اور تحقیقات کا یقین بھی دلاتے ہیں اور اس سلسلہ میں خاصی عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہیں کاش اس عقل مندی کا مظاہرہ پہلے کیا جاتا تو یہاں تک نوبت ہی نہ آتی حفاظتی اقدام کے طور پر خضدار کے تمام اسکول کالج دو دن کے لئے بند کر دیئے جاتے ہیں شام کوئٹہ میں ایک پریس نوٹ جاری کیا جاتا ہے جس میں بتایا گیا کہ "خضدار میں آج صبح طلباء کے ایک گروپ نے کلاسوں کا بائیکاٹ کیا سکول کے گیٹ بند کر دیئے اور بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے کچھ ارکان کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کے لئے سکول کے طلباء کو جمع کیا ان ارکان کو دو روز قبل حکومت کے خلاف نعرے لگانے پر گرفتار کیا گیا تھا احتجاجی طلباء نے بازار سے گزرنے کے بعد مقامی پولیس اسٹیشن اور حوالات کو گھیرے میں لے لیا جہاں گرفتار طلباء کو رکھا گیا ہے بعد میں طلباء نے پولیس کے ان سپاہیوں سے رائفلیں چھیننے کی کوشش کی جو پولیس چوکی کے گرد تعینات تھے پولیس کے سپاہیوں نے ذاتی دفاع میں مزاحمت کی جس کے دوران بھری ہوئی رائفلوں سے گولیاں چل گئیں جس کے نتیجہ میں ایک مزدور اکبر ولد غلام حسین ہلاک ہو گیا جبکہ ۱۵ افراد گولی لگنے اور پتھراؤ سے زخمی ہو گئے تین افراد شدید زخمی ہو گئے جن میں دو طالب علم اور ایک موچی شامل ہیں۔ حکومت بلوچستان نے اس واقعہ کی تحقیقات کا حکم دے دیا ہے"

حکومت بلوچستان کے اس پریس نوٹ نے لوگوں میں شک و شبہات کو اور بڑھا دیا اور ہر جگہ یہ کہا جانے لگا کہ لوگ زیادہ مرے ہیں حکومت تعداد کم بتا رہی ہے، جبکہ حقیقتاً حکومت نے صحیح اعداد و شمار مہیا کئے تھے پریس نوٹ کا سب سے مضحکہ خیز پہلو یہ تھا کہ بندوقیں خود بخود چل گئیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پولیس کیا اس بات کی وضاحت کرے گی کہ بندوقوں کے سیفٹی لاک کیوں نہیں لگے تھے اور انہوں نے بغیر آنسو گیس اور لاٹھی چارج کے بغیر ایسی صورت کیوں پیدا ہونے دی کہ جس کے نتیجے میں مظاہرین نے پولیس پر حملہ بول دیا جبکہ مظاہرین کی اکثریت ننھے منے بچوں پر مشتمل تھی اور ان کو تو ایک ڈنڈے سے بھی ڈرایا جا سکتا تھا۔

خضدار میں طالبعلموں پر فائرنگ کے دوسرے دن اتوار ۱۶ اپریل کو کوئٹہ کے تمام کالجوں میں طلبہ نے بطور احتجاج کلاسوں کا بائیکاٹ کیا اور جلسے اور جلوس نکالے سب سے پہلے احتجاجی جلسہ صبح ساڑھے آٹھ بجے بولان میڈیکل میں ہوا، پھر سائنس کالج میں ایسا ہی ایک جلسہ ہوا بعد میں آرٹس کالج اور پولیٹیکنگ انسٹیٹیوٹ کے طلباء تین بسوں میں بلوچستان یونیورسٹی پہنچے جہاں سب سے بڑا جلسہ ہوا اور جس سے تمام طالبعلم تنظیموں کے سربراہوں نے خطاب کیا یہاں سے طلباء جناح روڈ پہنچے جہاں سے ایک جلوس نکالا گیا جلوس قندھاری بازار میزان چوک لیاقت بازار سے ہوتا ہوا جنکشن مارکیٹ چوک پہنچا جہاں پولیس نے طلباء پر لاٹھی چارج کر کے انہیں منتشر کر دیا اور پندرہ طالب علموں کو حراست میں لے لیا جنہیں بعد میں رہا کر دیا گیا جلوس کے شرکاء خضدار کے شہداء کو سرخ سلام۔ لاٹھی گولی کی سرکار نہیں چلے گی، امریکی سامراج مردہ باد ———— کے نعرے لگا رہا تھا ایک اور جلوس سائنس کالج سے نکالا گیا جو جناح روڈ چھاؤنی، کینٹ کالج سے ہو کر دوبارہ سائنس کالج پر ختم ہوا۔ بولان میڈیکل کالج کی چند طالبات نے گرلز کالج جا کر وہاں بھی طالبات کو بائیکاٹ پر مجبور کیا، مستونگ کالج کے طلبہ نے بھی آج کلاسوں کا بائیکاٹ کیا اور بی ایس او کے صوبائی نائب صدر نے یوم سیاہ منانے کا اعلان کیا ہے بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن، عوامی گروپ کے چیئرمین تاج بلوچ۔ اسلامی جمعیت طلباء بلوچستان کے ناظم مختار احمد۔ کوئٹہ کے ناظم لطیف الرحمن ہزارہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکریٹری مظفر حسین چنگیزی پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اورنگ زیب اس سانحہ کی مذمت کر چکے ہیں بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے مرکزی سیکریٹری جنرل حبیب جالب نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا:

انہوں نے پریس کانفرنس میں بلوچ رہنماؤں خیر بخش مری۔ غوث بخش بزنجو۔ عطاء اللہ مینگل۔ شیر محمد مری۔ گل خان نصیر پر بھی شدید نکتہ چینی کی اور کہا کہ ان کی زبان پر تالے پڑے ہیں کہ وہ اب تک کچھ نہیں بولے اور انہوں نے زخمیوں کی تیمارداری بھی نہیں کی۔ انہوں نے روزنامہ جسارت کراچی کی بھی شدید مذمت کی جس نے معصوم طلباء کو شر پسند کہا ہے۔

نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی بلوچستان کے صدر محمود عزیز کرد نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بلوچستان میجر جنرل غلام محمد کو آج ایک تار ارسال کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ خضدار میں اسکول کے بچوں پر ظالمانہ فائرنگ صوبائی انتظامیہ کے بعض عناصر کی جانب سے صورت حال کو خراب کرنے اور عوام کو حکومت سے متنفر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس ضمن میں صوبائی انتظامیہ نے جو پریس نوٹ جاری کیا ہے وہ حقائق کے برعکس اور صورت حال کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی ایک واضح مثال ہے۔ مسٹر کرد نے اپنے برقیہ میں کہا ہے کہ کوئی بھی ذی شعور شخص اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا کہ پولیس سے خود بخود گولیاں چل گئیں جس سے یہ افسوسناک واقعہ ہوا انہوں نے کہا ہے کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ پولیس نے بغیر کسی تنبیہہ یا جواز کے سکول کے بچوں اور لوگوں پر گولیاں برسائیں اور کوئی بھی حکومت ایسا نہیں کر سکتی۔ انہوں نے کہا کہ خضدار کے حالیہ واقعہ سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ صوبائی انتظامیہ سے عوام دشمن عناصر کو صاف کرنے کی اشد ضرورت ہے جو کہ غیر ضروری طور پر بلا کسی اشتعال کے امن و امان کی صورت حال پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور جب تک ایسے عناصر کی صفائی نہیں کی جاتی اس وقت تک حالات کو معمول پر لانے اور مفاہمت پیدا کرنے کا مقصد حل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ جو لوگ اس واقعہ کے ذمہ دار ہیں انہیں فوری طور پر گرفتار کر کے سخت اور عبرتناک سزائیں دی جائیں

ادھر طلباء نے اعلان کیا ہے کہ وہ کلاسوں کا بائیکاٹ۔ جلسہ و جلوس اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک کہ سانحہ خضدار کے ذمہ دار افراد کو برسر عام پھانسی نہیں دی جاتی۔

OO

حسن کامران

یہ زمین
ایڈمنسٹریٹو کمیٹی کے عملہ کے لئے سونا اگل رہی ہے

مارکیٹیں، خاندانی جائیداد کی طرح فروخت کی جاتی رہیں

حیدرآباد کے مشرقی جنوب میں واقع بستی لطیف آباد ۱۹۵۰ء میں صرف اس وجہ سے بسائی گئی تھی کہ یہاں ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کو آباد کیا جا سکے اور اس مقصد کے لئے حکومت کو تالپور خاندان نے ۱۸۵۰ ایکڑ زمین بلا قیمت فراہم کی تھی جس پر ملک کا سب سے بڑا اور ارزاں قیمت رہائشی منصوبہ تیار کیا تھا۔ لیکن ملک کا سب سے بڑا اور ارزاں قیمت منصوبہ آج چند لوگوں کے روپیہ کمانے کا ذریعہ بن گیا۔ جب کہ ہزاروں خاندانوں کے لئے مصیبت اور مشکلات کے نئے باب کھول گیا ہے۔

لطیف آباد کے وہ لوگ جن کے پاس سفارش نام کی چڑیا نہیں ہے یا جن کے سینوں پر بااثر ہونے کا تمغہ نہیں ہے اسے کبھی بھول بھلیوں کا نام دیتے ہیں تو کبھی کینسر کے موذی مرض سے اس کی مشابہت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس طبقہ امرا اس علاقے کو بہترین علاقہ قرار دیتا ہے اور وہ ایسا کہنے میں حق بجانب اس لئے ہیں کہ پانچ روپے فی مربع گز سرکاری قیمت کی زمین آج ڈیڑھ سو روپے فی مربع گز فروخت ہو رہی ہے لطیف آباد ایڈمنسٹریٹو کمیٹی کے عملہ کے لئے تو یہ زمین سونا اگل رہی ہے۔

لطیف آباد کے منصوبہ کے ساتھ ساتھ اس کے انتظام کو چلانے کے لئے لطیف آباد ایڈمنسٹریٹو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس کا سربراہ ڈپٹی کمشنر ہوا کرتا تھا۔ جبکہ کمیٹی کا سیکریٹری سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنے کا اختیار رکھتا تھا انہیں اختیارات کی چکاچوند نے جہاں عملے کو لکھ پتی بنا دیا وہاں عوام کو مسائل کے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا کمیٹی کے غلط طریقہ، افسران کی من مانی اور عملہ کی ہٹ دھرمی رشوت ستانی نے جب عوام کو کہیں کا نہ چھوڑا تو کمیٹی کو براہ راست بلدیہ کی نگرانی میں دے کر لطیف آباد کو بھی شہر کا درجہ دے دیا گیا

اس وقت کمیٹی کے سیکریٹری جب ڈسٹرکٹ ہاؤسنگ آفیسر بھی کہا جاتا ہے ۱۹۷۵ء سے یہاں براجمان ہیں جبکہ ایک ہیڈ کلرک گذشتہ ۱۶ سال سے کمیٹی کے لئے کیس بن گئے ہیں۔ یہ اس دفتر کی ریت رہی ہے کہ یہاں سے کوئی بھی اپنی مرضی اور خواہش سے نہیں جاتا ہے اور نہ گیا ہے بلکہ ایسے جب خود اپنے جال میں پھنس جاتے ہیں تو دفتر سے فرار اور نوکری سے غائب ہو جاتے ہیں۔ حال ہی میں ایک صاحب کا تبادلہ بلدیہ کے محکمہ ٹیکس میں ہوا ہے لیکن موصوف سونے کی اس کان سے باہر نکلنے پر تیار ہی نہیں ہیں بلکہ چارج نہ چھوڑنے کی خاطر انہوں نے دفتر آنا ہی بند کر دیا ہے اور ان کی وجہ سے سینکڑوں افراد کاغذات کا پلندہ دبائے روزان کے دفتر آنے کا انتظار کرتے ہیں۔

لطیف آباد بارہ یونٹوں میں تقسیم ہے اور ہر یونٹ ماتم کناں ہے کہ اس کے تجارتی اور فلاحی پلاٹ عملہ کے افراد نے اپنی خوشیوں کی نذر کر دیئے۔ تجارتی پلاٹ کو تو رہائشی پلاٹ میں تبدیل کیا ہی تھا لیکن فلاحی پلاٹ بھی نہ چھوڑے جبکہ یہ ان کے اختیار ہی میں نہیں تھا۔

لطیف آباد کے ہر یونٹ میں پارک، ڈسپنسری، ہسپتال اور اسکول کے لئے پلاٹ مقرر ہوئے تھے جبکہ مسجد اور قبرستان کے لئے پلاٹوں کا کوئی وجود نہ تھا لیکن لیکن لطیف آباد کا کاغذ پر موجود پرانا نقشہ آج زمین پر موجود نئے نقشے سے بہت مختلف ہے جہاں جگہ جگہ عملہ کی بدعنوانیاں اور دھاندلیاں نقش ہیں۔ متعدد فلاحی پلاٹوں کی منظوری حاصل کئے بغیر رہائشی اور تجارتی پلاٹوں میں تقسیم کر کے الاٹ کر دیا گیا ہے۔ یونٹ ۱۲ میں چنگی ناکہ کا پلاٹ اور عمارت، یونٹ ۲ میں فلاحی پلاٹ، یونٹ ۱۰ کی گرین بیلٹ، کئی یونٹوں میں سرکاری تعمیر مارکیٹیں، مختلف اوقات میں مختلف رقموں کے عوض اس طرح فروخت کی جاتی رہی ہیں جیسے خاندانی جائداد فروخت کی جاتی ہے۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ جب کہ لطیف آباد لٹ چکا ہے۔

فلاحی پلاٹوں کو رہائشی مکانوں کے لئے فروخت کر دیا گیا

لطیف آباد یونٹ ۸ کا حضرت عائشہ پارک اسی مقصد کے لئے تہس نہس کرایا گیا ہے کہ پارک کی عملاً ضرورت نہ ہونے کو بنیاد بنا کر فروخت کر دیا جائے اس کی چاردیواری بھی بلدیہ کے خرچ پر تعمیر کرائی گئی تھی لیکن اندر گھاس اگانے کی ضرورت آج تک محسوس نہیں کی گئی ہے بلکہ بعض پرائیویٹ پارٹیاں ایسی ہیں جو عملے سے مل کر اس پارک کو رہائشی مقصد کے پلاٹ میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

یونٹ ۱۰ میں لطیف آباد کے قیام کے وقت کوارٹروں میں سرکاری خرچ پر دکانیں بھی تعمیر کرائی گئی تھیں لیکن ان کو بھی کوارٹر کا نام دے کر فروخت کر دیا گیا اسی طرح یونٹ ۱۰ کو اے اور بی میں تقسیم کر کے سڑکوں تک پر پلاٹ بنا کر لوگوں کو الاٹ کر دیئے گئے۔ پلاٹوں کے ان غازیوں نے یونٹ ۴ اے میں موجود ۵ ایکڑ کے فلاحی پلاٹ کو اپنی نگرانی میں تقسیم کیا۔ نا پا اور لوگوں کو عمارتیں تعمیر کرنے کی اجازت دے دی یہاں آج لاکھوں روپے کے مکان کھڑے ہیں لیکن پلاٹ ابھی تک فلاحی مقصد کے لئے مخصوص ہے۔ یونٹ ۷ کے ایک پارک پر لوگوں سے بھاری رقمیں وصول کر کے قبضہ کرا دیا گیا اور پٹی یہ پڑھائی کہ قبضہ سچا ہوتا ہے تم کو ہی الاٹ ہو جائے گا۔ اس طرح ان لوگوں کو قابضین کی صف میں کھڑا کر دیا گیا۔ یونٹ نمبر ۸ میں گوشت کے بیوپار میں موجود زمین کو جو مارکیٹ کا حصہ تھا پلاٹ میں تقسیم کر کے ایک اسٹیٹ ایجنسی کے اشتراک سے فروخت کر دیا گیا جبکہ بعض افراد کی زبان بندی کے لئے ایک دو پلاٹ ان کی نذر کر دیئے گئے۔

تجارتی اور فلاحی پلاٹ کو رہائشی پلاٹ میں تبدیل کرنے کا نسخہ اسی اسٹیٹ ایجنسی کی ایجاد ہے اور انہوں نے ہی یہ راستہ کمیٹی کے ملازمین کو دکھایا بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب پلاٹ ختم ہونے لگے تو سڑکیں اور پانی کی ٹنکیاں تک الاٹ کر دی گئیں۔ یونٹ ۵ میں پانی کی ٹنکیوں، یونٹ ۱۰ اور ۷ میں سڑکوں کی الاٹمنٹ کے واقعات سے کوئی بھی لاعلم نہیں ہے۔

لطیف آباد کے مختلف یونٹوں میں مکانات کے نمبروں کے ساتھ اے اور بی کی دم کی ایجاد کا سہرا کمیٹی کے انہیں مفاد پرست ملازمین کے سر جاتا ہے اور اس ایجاد کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ جن مکانات کے برابر میں تھوڑی بہت بھی فالتو زمین پڑی تھی اس پر آخری مکان کے نمبر کے ساتھ اے لگا کر الاٹ کر دیا گیا۔ یعنی ۴۴ کے ساتھ ساتھ ۴۴ اے اور ۶۵ کے ساتھ ۶۵ بی بھی بنا دیا گیا جبکہ نقشہ میں اے اور بی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

تجارتی پلاٹوں میں جو سنگین بدعنوانیاں یہاں ہوئی ہیں غالباً اور کہیں کسی رہائشی منصوبہ میں نہ ہوئی ہوں گی اور نہ ہو سکیں گی۔ سنگیت سینما کی پشت پر واقع پلاٹ یونٹ ۵ کی سرکاری مارکیٹ کا پلاٹ یونٹ ۶ میں ابرار سینما کے برابر کا پلاٹ، یونٹ ۱۱ میں مارکیٹ پلاٹ، عملہ کی کارگزاریوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں، لطیف آباد ٹاؤن شپ کے بائی لاز میں یہ شق موجود ہے کہ تجارتی پلاٹ رہائشی پلاٹ میں کسی حالت میں تبدیل نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک انسپکٹر نے تمام قوانین کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ایک ایجنٹ کے نام یونٹ ۵ میں پلاٹ ۴۴ نیلام کر دیا۔ یہ نیلام بھی لطیف آباد میں ہونے والے تمام نیلاموں کی طرح بوگس اور فرضی تھا۔ لطیف آباد میں آج تک کوئی پلاٹ کھلے نیلام کے ذریعے فروخت نہیں ہوا ہے بلکہ خاموش نیلام جسے دفتر کے لوگ ٹیبل نیلام کہتے ہیں کے ذرائع پلاٹ اپنے ہی آدمیوں کو الاٹ کئے گئے۔ پھر ان لوگوں سے دوسرے افراد کو فروخت کرا کے رقم کھری کر لی گئی ہے اس کیس میں یہی ہوا کہ صرف ۳۰ ہزار چھ سو اٹھاون روپے میں بولی ختم کر دی گئی جس کے نام بولی چھڑائی گئی اسے نقد دو ہزار روپے دیئے گئے اور اس نے پلاٹ اسٹیٹ ایجنسی کے نام رجسٹری کر دیا۔ ایجنسی کے مالک کے بڑے پلاٹ کے کئی ٹکڑے کئے اور کوڑیوں میں خریدا ہوا پلاٹ لاکھوں میں فروخت کر دیا۔ اسی طرح ایک اور کمرشل پلاٹ کی نیلامی کو ایک سابق ڈپٹی کمشنر نے منسوخ کر دیا تھا لیکن ڈپٹی کمشنر کے تبادلے کے بعد پرانے احکامات فائل سے غائب کر کے پلاٹ دوبارہ ارزاں داموں نیلام کیا ہوا دکھا کر دے دیا گیا۔

لطیف آباد کی بھول بھلیوں میں اگر کبھی کوئی پلاٹ ٹرانسفر کرانے کا مسئلہ پیش آ جائے تو یہ معمولی نوعیت کا کام اچانک اہمیت اختیار کر جاتا ہے اور مفت میں کیا جانے والا کام ہزاروں روپے رشوت کے عوض کیا جاتا ہے اس کے برعکس اگر عملہ کا کوئی فرد کسی پلاٹ میں دلچسپی رکھتا ہو تو یہ کام پلک جھپکتے ہو جاتا ہے۔ اسی طرح الاٹمنٹ کا معاملہ ہے۔ گذشتہ کئی ماہ سے نئے الاٹمنٹ کا اجراء سرکاری طور پر بند ہے لیکن اس کا توڑ بھی پیدا کر لیا گیا ہے۔ ادر کمیٹی کی "مال کھاؤ کمیٹی" نے ایسی کاریگری دکھائی ہے کہ عقل حیران ہے وہ ماضی کی تاریخوں میں الاٹمنٹ جاری کرتے ہیں پھر اس پر "نظر ثانی شدہ" الاٹمنٹ تحریر کر کے نئی تاریخ میں الاٹ کر دیتے ہیں کام کا کام ہو جاتا ہے اور ریکارڈ میں بھی نہیں آتے۔ سینکڑوں ایسے الاٹمنٹ جاری کئے گئے ہیں جن پر "نظر ثانی شدہ" کا اضافہ ہے ابھی حال ہی میں یونٹ ۱۲ میں چنگی ناکہ کا ایک پلاٹ ایک مسمات کے نام الاٹ کیا گیا ہے۔ اس پلاٹ پر ناجائز قبضہ رکھنے کے الزام میں ان خاتون کے شوہر کو ۱۶ جنوری ۸۰ء کو بلدیہ نے نوٹس دیا جبکہ ۱۴ جنوری ۸۰ء کو پلاٹ اس کے نام الاٹ کر دیا گیا۔

لطیف آباد ایڈمنسٹریٹو کمیٹی کی بنیاد جعلسازی پر ہے۔ ہر کام، ہر کاغذ جعلی بنا کر تھما دیا جاتا ہے نہ صرف کاغذات جعلی تیار کر دیئے جاتے ہیں بلکہ کوارٹروں کی رقم جمع کرنے کی رسیدیں تک جعلی جاری کی گئی ہیں۔ لطیف آباد کے کوارٹروں کی قیمت کے ضمن میں کتنی رقم وصول ہوئی ہے اور کتنے بقایا جات ہیں اس کی تفصیل کہیں بھی تحریر میں نہیں ہے جس انسپکٹر کی مرضی میں جتنی رقم آتی ہے وہ نوٹس پر تحریر کر کے مالک کوارٹر کو روانہ کر دیا جاتا ہے اور جب لوگ دفتر کے چکر لگاتے لگاتے تھک جاتے ہیں تو سود در سود اور ہندسوں کا کھیل دکھا کر حقیقی واجب الادا رقم سے کہیں زیادہ رقم رشوت میں وصول کر لی جاتی ہے

۲۲ اپریل کو سوویت یونین کے بانی ولادیمیر لینن کے یوم پیدائش کے موقع پر لینن کی یاد میں ایک مضمون، تحریر: وکتور بوگوسلوفسکی

نو آزاد ممالک میں سوشلسٹ رجحانات پیدا ہو رہے ہیں

دُنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں کے محنت کش عوام عظیم لینن کا نام محبت اور احترام سے نہ لیتے ہوں۔ لینن ازم سامراج کے خلاف ترقی پسند انقلابی قوتوں کی جدوجہد کا علم اور امن اور سماجی ترقی کی جدوجہد کا پرچم بن چکا ہے۔

لینن نے ایشیا اور افریقہ کی قوموں کو ترقی اور سوشلزم کی راہ دکھائی۔ موقع پرستوں کے ان دعوؤں کو بے نقاب کیا کہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک کو سوشلزم کی سمت میں ترقی کرنے سے پہلے سرمایہ دارانہ نظام کے مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔ "یہ مفروضہ غلط فہمی پر مبنی ہے کہ پسماندہ قوموں کو لازمی طور پر ترقی کے سرمایہ دارانہ مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔" لینن نے زور دیتے ہوئے کہا لینن نے بتایا کہ ایشیائی اور افریقی ممالک عالمی سوشلزم کی طاقت ور قوتوں پر اعتماد کرتے ہوئے اور سوویت یونین کے ساتھ تعلقات کو فروغ دے کر سرمایہ دارانہ نظام کے مرحلے سے گزرے بغیر، سوشلزم کی جانب پیش قدمی کر سکتے ہیں۔ افریشیائی ممالک کی سماجی ترقی کا عمل لینن کے اس نظریہ کی صداقت کا ثبوت فراہم کر رہا ہے۔

نوآبادیاتی محکومی سے چھٹکارا پانے کے بعد بہت سے ممالک نے سوشلسٹ سماج کی تعمیر کو اپنا طویل المیعاد مقصد قرار دیا۔ سوشلزم کی راہ پر چلتے ہوئے یہ ممالک ایسی گہری سماجی۔ معاشی تبدیلیاں لا رہے ہیں، جس سے محنت کش عوام کو فائدہ پہنچے گا۔

لیکن یہ راہ آسان نہیں۔ سوشلزم کی جانب تبدیلی کے لئے محض غیر ملکی صنعتی اداروں کو قومیانا یا استحصال کنندوں کے حق ملکیت کو ختم کرنا ہی کافی نہیں، پیداواری قوتوں کو ترقی دینے کے لئے زبردست پیش قدمی کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ پسماندہ ممالک میں سوشلزم کی راہ عبوری اقدامات کے ایک سلسلے سے ہو کر گزرتی ہے جو سماجی ترقی کے لئے کئے جاتے ہیں اور جس کے دوران سوشلزم کی مادی اور سماجی بنیادیں بتدریج قائم کی جاتی ہیں اہم بات یہ ہے کہ نو آزاد ممالک کے بہت سے رہنماؤں نے لینن کے اس مفروضے کو سمجھ لیا ہے اور یہ لوگ سوشلسٹ ترقی کے مقاصد سے واقف ہیں جو یہ ہیں۔

انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کا خاتمہ کرنا۔ استحصال کرنے والے طبقات کا مکمل طور پر خاتمہ کرنا محنت کش عوام کے مفادات کے لئے پیدا کی جانے والی دولت کی منصفانہ تقسیم کا نظام قائم کرنا زندگی کے تمام شعبوں میں محنت کش عوام کے غالب رول کو مستحکم بنانا، حقیقی معنوں میں عوامی جمہوریت قائم کرنا

نیا سماجی نظام عوام کی انقلابی توانائی اور ان کی شاندار محنت سے جنم لیتا ہے۔ وہ ان سے عظیم تعمیری کوششوں، محنت کی روز افزوں پیداواری استعداد ملکی وسائل کے زیادہ سے زیادہ استعمال اور سخت معاشی نظم و نسق کا طالب ہوتا ہے۔

صرف مذکورہ بالا عناصر کے عمل کی صورت میں ہی سوشلزم کی جانب پیش قدمی کرنے والا ملک اپنی پسماندگی پر قابو پا سکتا ہے اپنی معیشت اور ثقافت کی ترقی اور عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی یقین دہانی کر سکتا ہے۔

لینن نے بار ہا زور دیکر کہا ہے کہ سوشلزم ایک طبقاتی اور سیاسی نظریہ ہے، محنت کش عوام کے اقتدار کا قیام، انسانی محنت کی فتح اور استحصال سے آزاد سماج کی تعمیر اس کا نچوڑ ہے، ایسا سماج جس میں سے وسائل پیداوار کی نجی ملکیت کا خاتمہ کر دیا گیا ہو۔

یہ لینن ہی تھے جنھوں نے مشرق کے ممالک کے مخصوص حالات میں سائنسی سوشلزم کے عمومی اصولوں کا اطلاق کرنے کے طریق ہائے کار وضع کئے۔ لینن نے بتایا کہ قومی امتیازات، مختلف ممالک کی مختلف معاشی اور سماجی ترقی خصوصی روایات وغیرہ کے پیش نظر ضرورت اس بات کی ہے کہ کمیونزم کے بنیادی اصولوں کا اطلاق کیا جائے۔ اس بات کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا عوام کا ذہنی انقلاب ایک پیچیدہ سلسلۂ عمل ہے، لینن نے مشرقی اقوام کی کمیونسٹ تنظیموں کی دوسری کانگریس کے مندوبین سے کہا: "آپ کو چاہیئے کہ کمیونزم کے عمومی نظریہ

اور عمل کو بنیاد بناتے ہوئے، آپ خود کو ان مخصوص حالات کے مطابق تبدیل کریں جو یورپی ممالک میں موجود تھیں آپ کو چاہیئے کہ آپ اس نظریہ اور عمل کو حالات کے مطابق بنائیں، کیونکہ آبادی کا بڑا حصہ کسانوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک مشکل لیکن عظیم فریضہ ہے کیونکہ اب عوام کا وہ حصہ جدوجہد میں شامل ہو رہا ہے جس نے اب تک اس میں حصہ نہیں لیا تھا۔

لینن سمجھتے تھے کہ ایشیائی اور افریقی ممالک میں سوشلزم کو فتح مند بنانے کے لئے ضروری ہے کہ مارکسٹ لیننسٹ اور انقلابی۔ ڈیموکریٹک پارٹیوں کا مستحکم اتحاد قائم ہو، انقلابی ڈیموکریٹس سائنسی سوشلزم کی راہ اختیار کریں اور مزدور طبقے اور کسانوں کے درمیان روز افزوں اتحاد قائم ہو۔ وہ سوشلسٹ ممالک اور افریشیائی ممالک کی قوموں کے درمیان دوستی اور مساویانہ تعاون کو اس فتح کی ایک اہم شرط سمجھتے تھے۔

سوویت عوام کے علاوہ بہت سے نو آزاد ممالک کے عوام لینن کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں سوویت یونین اور تیسری دنیا کے ممالک کے درمیان باہمی طور پر منفعت بخش اور مساویانہ تعاون فروغ پا رہا ہے نو آزاد ممالک میں سوشلسٹ رجحانات پیدا ہو رہے ہیں جن کا اظہار نمایاں طور پر ان کی عملی سرگرمیوں میں ہو رہا ہے لینن کا کاز اور ان کے عظیم نظریات زندہ ہیں اور فتح مند ہو رہے ہیں۔

○○

ایڈیٹر کا صفحہ

"لے کے رہیں گے پاکستان" سے "بچا کے رہیں گے پاکستان" تک

میں آج کل ان بزرگوں کی تلاش میں ہوں. جو برصغیر کے مختلف گوشوں میں، "لے کے رہیں گے پاکستان بن کے رہے گا پاکستان" کے نعرے بلند کیا کرتے تھے
میں ان نوجوانوں کی تلاش میں ہوں جو انگریز کی ہیبت اور دبدبے سے بے خوف اپنے حقوق کے لئے سر بکف میدان میں اتر آئے تھے۔
میں اس خاتون کو ڈھونڈتا ہوں جو لاہور میں سیکرٹریٹ کی عمارت پر چڑھ گئی تھی اور جس نے پاکستان کا پرچم سر بلند کر دیا تھا۔
میں ان ہزاروں لاکھوں بچوں کی تلاش میں ہوں جو میری طرح ایک مال گاڑی کے کھلے اور دھوپ میں تپتے ڈبے میں آگ اور خون کے دریاؤں سے گزر کر پاکستان پہنچے تھے۔
میں تحریک پاکستان کے رہنماؤں، کارکنوں اور جاں نثاروں کی تلاش میں ہوں۔
اس سرزمین کی سرحدوں میں کس کس کا لہو ہے میرے کتنے بھائی، کتنے بزرگ، کتنی بہنیں۔ اس ملک کی بنیادوں کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر گئے تھے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء ۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کتنے سنگین حالات تھے کیا جدوجہد تھی، کیا قربانیاں تھیں کیا ہم سب کو یاد نہیں اس وقت ہماری آستینوں میں چھپے سانپ کون کون تھے۔ اور کس کس نے ہماری بغل میں چھرا گھونپنے کی کوشش کی تھی کس کس نے قائداعظم کو نعوذ باللہ کافر اعظم کہا تھا۔ کس کس نے پاکستان کو ناپاکستان کہا تھا۔ پاکستان کا قیام روکنے کی کوششوں میں کس کس نے برطانوی استعمار کے ہاتھ مضبوط کئے تھے۔ ہمارے بزرگوں نے جو اس وقت مسلم لیگ کا علم اٹھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے شکل و صورت سے مسلمانوں مگر ہندوؤں اور انگریز کے گماشتوں کی بڑی بے جگری سے مخالفت کی تھی۔
میں آج ان بزرگوں کو ڈھونڈتا ہوں۔ گواہی کے لئے شہادت کے لئے، کہ قیام پاکستان کے یہ مخالفین کون کون تھے۔ ان کا اس وقت کیا رویہ تھا؟ قیام پاکستان کے بعد ان کا کیا رویہ رہا۔ عوام نے انہیں آج تک منتخب کر کے اپنے سر پر کیوں نہیں بٹھایا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے ارادوں میں اپنے مشن میں کامیاب کیوں نہیں ہونے دیا۔
میں تحریک پاکستان کے ان جیالے کارکنوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس وقت جو لوگ اسلام کے نام پر، دین کے نام پر، فتوے عائد کر کر کے ان کے مقدس مشن قیام پاکستان کو سبوتاژ کیا کرتے تھے کیا کوئی محب وطن پاکستانی ان کی عزت و تکریم کر سکتا ہے۔ کیا انہیں یہ حق دے سکتا ہے کہ وہ آج اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن جائیں جس کے قیام کی انہوں نے مخالفت کی تھی۔
میں ان بیواؤں اور یتیموں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جس عظیم مقصد کے لئے ان کے سہاگ قربان ہوئے جس عظیم جدوجہد میں باپ بیٹوں سے جدا ہوئے کیا اس جدوجہد کے مخالفین کو وہ آج یہ حق دیں گے کہ وہ اسی جدوجہد کے عظیم ثمر پاکستان کو اپنی مذموم خواہشات کا مرکز بنائیں۔ آج قیام پاکستان کے سب مخالفین متحد ہیں۔ اندرون ملک وہ جماعتیں جنہوں نے قیام پاکستان کی سر توڑ مخالفت کی۔ اکھنڈ بھارت کے دعویدار جن سنگھ، جماعت اسلامی اور دوسرے برطانوی سامراج۔
قیام پاکستان کے مخالفین ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت ۳۰ سال سے پاکستان کے تمام اہم اداروں میں جس منظم انداز سے داخل ہوئے تھے ان کے اس خوفناک منصوبے کے نتائج اب ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ بیوروکریسی میں، سفارت خانوں میں۔ اور دوسرے حساس اداروں میں قیام پاکستان کی مخالف جماعتوں سے وابستہ افراد اب اپنے اداروں کے سربراہوں کے احکام کی بجائے اپنی جماعت کے سربراہوں کے احکام پر چل رہے ہیں قیام پاکستان کی مخالف ایک جماعت کے بانی اب پوپ پال کا درجہ اختیار کر چکے ہیں، وہ روشنی کا منبع ہیں، سب ان کے در پر حاضری دیتے ہیں۔ اکتساب فیض کے بعد ونڈتاتے پھرتے ہیں۔
یہ ہم پاکستانیوں کی روایتی پاسداری اور شرافت کا سبب ہے کہ ہم نے اپنی جڑیں کھودنے والوں، اپنے وطن کے قیام کی راہ میں باقاعدہ رکاوٹیں کھڑی کرنے والوں، اپنی کتابوں میں باقاعدہ پاکستان کے خلاف مہم چلانے والوں، سواد اعظم کے جذبات کو مجروح کرنے والی تحریروں کے خالقوں کو ہم نے اس ملک میں برداشت کر رکھا ہے، انہیں اسلام کا لبادہ اوڑھ کر پاکستان کی بقاء کو سبوتاژ کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ تمام اہم اداروں میں گھس کر ان اداروں کی سلامتی کو خطرے میں ڈالنے کی اجازت دے رکھی ہے۔
ان لوگوں نے آج تک اپنے اس کردار پر

باقی صفحہ ۵۰ پر

فلمی ستارے

سیاستدانوں کی نا اہلی کا حساب کتاب ابھی تکمیل کے آدھے مراحل بھی طے نہ کر پایا ہے کہ فلمی ستاروں کو ادائیگی انکم ٹیکس کے نوٹس جاری کر دیئے گئے ہیں۔ اس نوٹس کی زد میں آنے والے انڈسٹری کے ممتاز اداکاروں کے ذمے ۴۰ لاکھ روپے واجب الادا ہیں۔ محکمہ نے نوٹس میں اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ بصورتِ دیگر ان کی جائیداد نیلام کر دی جائے گی یہ نیلامی، فلمی ستاروں کی نیندیں اڑانے کے لئے کافی ہے۔ لوگ اس سلسلے میں دلچسپ قصے بیان کر رہے ہیں مثلاً یہ کہ زیبا نے فوری طور پر میک اپ کے استعمال میں کمی کر دی ہے تاکہ وہ اپنے اخراجات کو کنٹرول کر سکیں۔ اُدھر آسیہ جن کے پنجابی فلموں کے ناچوں کی دھوم ہے اب بڑی لگن سے اس سے زیادہ محنت کر رہی ہیں تاکہ بیلنس برابر کر سکیں۔

اداکارہ شبنم جن کے ذمے سب سے زیادہ رقم نو لاکھ روپے واجب ہے آج کل اپنی وارڈروب اور جیولری پر نظرِ ثانی کر رہی ہیں۔

اداکار شاہد! شادی کے بعد سے ویسے بھی کنگال رہتے ہیں۔ اس نوٹس نے ان کے ہوش اڑا دیئے ہیں۔ عالیہ فلمی دنیا کو تقریباً تیاگ چکی ہیں۔ نوٹس کی وصولی کے بعد سے بہت پریشان ہیں۔ شاید مجبوراً دوبارہ فلموں میں واپس آنے کا فیصلہ کر لیں۔ ایک اطلاع کے مطابق سب سے زیادہ مطمئن اداکارہ سنگیتا ہیں۔ خیر یہ بھی ہے کہ اداکاروں نے مارشل لاء حکام سے اپیل کی ہے کہ ان کے ذمے واجب الادا رقوم اقساط میں وصول کی جائیں۔

شاہ فرید الحق

مشیر پیش امام
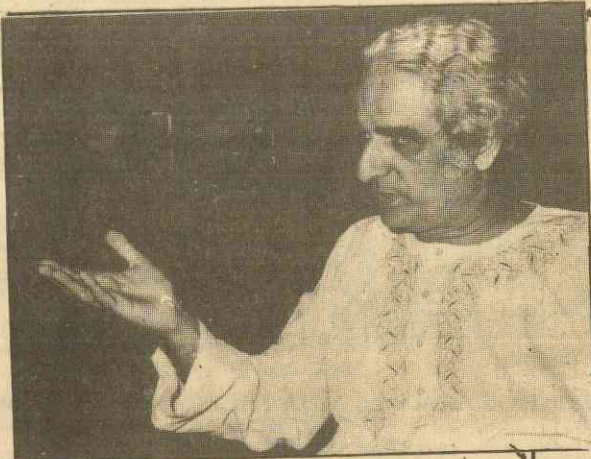
مولانا شاہ احمد نورانی کی غیر حاضری میں جمعیت علمائے پاکستان کے نمبر ایک شاہ فرید الحق اور تحریکِ استقلال کے نمبر ۲ مشیر احمد پیش امام چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کی ۱۴ اپریل کو قومی حکومت اور دیگر امور پر مختلف سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کے سلسلے میں شرفِ ملاقات حاصل نہ کرنے کے سبب ان دنوں شدید برہمی کا شکار ہیں۔ مارشل لاء ضابطہ ۳۳ کے سبب وہ اپنی آراء کا کھل کر اظہار تو نہیں کر پا رہے مگر نجی محفلوں میں وہ بہت شکوہ کناں ہیں۔

پروفیسر شاہ فرید الحق کے ساتھ تو خیر یہ ہوا کہ انہیں سرے سے دعوت ہی نہیں دی گئی یہ اور بات ہے کہ وہ اخبار نویسوں اور اپنے سیاسی دوستوں سے یہی کہتے رہے کہ ہمیں بلایا بھی گیا تو نہیں جائیں گے مگر بے چارے مشیر احمد پیش امام اور اُن کے دیگر تین ساتھیوں کے ساتھ یہ ہوا کہ اسلام آباد پہنچ کر وہ باری کا انتظار کرتے رہے مگر انہیں یہ کہہ کر لوٹا دیا گیا کہ وہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر صرف پارٹی سربراہوں ہی سے ملاقات کریں گے۔ ایئر مارشل اصغر خان نے براہِ راست ملاقات سے گریز کے طریقے کو اپنایا تھا۔ اس لئے جو کچھ پیش امام صاحب کے ساتھ ہوا ہے اسے سیاسی حلقے "نہلے پر دہلا" سے تعبیر کر رہے ہیں۔

op

اور اب سرفراز نواز بھی

کیری پیکر نے اپنی فتوحات کا دائرہ اب برصغیر تک پہنچا دیا ہے۔ پاکستانی ٹیم جو ابھی تک اپنے پانچ ممتاز کھلاڑیوں کے زخمِ مفارقت کو سہلا رہی تھی اب بقایا اسٹار کھلاڑیوں سے ہاتھ دھونے کی تیاری کر رہی ہے۔ لندن میں ایک طرف ٹیم کے مینیجر جاوید میاں داد اور ہارون الرشید کی مایوس بیٹھی ہوئی دلہن کی طرح حفاظت کر رہے ہیں، تو دوسری طرف سرفراز نواز نے اپنے پُراسرار دوروں سے پاکستانی ٹیم کے لئے پھر مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ انگلینڈ ٹیم کے پاکستان دورے کے موقع پر اچانک لندن بھاگ کر انہوں نے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی اب بھارت میں عباس علی بیگ امدادی کرکٹ میں حصّہ لینے کے بعد پاکستان واپس آئے تو خاموشی سے ٹکٹ لے کر پھر بمبئی چل پڑے۔ بمبئی میں ان کے اچانک کیا "انٹرسٹ" پیدا ہو گئے ہیں، لوگ اسی بارے میں کیا کہانیاں سُنا رہے ہیں، اور ڈر بھی ایسے ہیں کہ کہیں موصوف لندن اس وقت نہ پہنچیں جب چڑیاں کھیت چگ چکی ہوں۔

oo

کراچی کے اخبار نویس ہر جدوجہد میں پیش پیش ہوں گے

معیار رپورٹ

کراچی یونین آف جرنلسٹس اور ایمپنک کراچی اپنی مرکزی تنظیموں کے اجلاس میں منظور کی جانے والی قراردادوں کی روشنی میں اخباری صنعت کو درپیش سنگین مسائل کے حل کے لئے اخباری مراکز میں ۱۳ اپریل سے مسلسل جلسے منعقد ہو رہے ہیں ان جلسوں میں اخباری کارکن بھرپور طریقے سے شرکت کر رہے ہیں اور اس عزم کا اعادہ کر رہے کہ ۲۲ اپریل کو لاہور میں ایمپنک اور پی ایف یو جے کی مرکزی مجالس عاملہ مساوات لاہور کی جبری بندش، مدیروں کی گرفتاری، امن، صداقت، تعمیر، ہیرالڈ، معیار، الفتح اور دیگر اخبارات و رسائل سے ضمانت طلبی اور پریس کے خلاف مسلسل غیر معمولی قوانین کے استعمال کے خلاف جو بھی عملی اقدام اٹھائیں گی، اس میں کراچی کے اخباری کارکن ماضی کی طرح کسی بھی بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرینگے۔

۱۳ اپریل کو ایمپنک کراچی کمیٹی اور کے۔ یو۔ جے کے مشترکہ اجلاس میں مختلف کمیٹیاں تشکیل دی گیئں جو ممکنہ اقدامات کی صورت میں رابطے کا کام کریں گی۔ کے۔ یو۔ جے کے قائم مقام صدر ناصر بروہی کی زیر صدارت اجلاس نے اپنی مرکزی تنظیموں کی مجلس عمل کو یقین دلایا کہ ملک کے دوسرے علاقوں کی طرح کراچی کے اخباری کارکنوں کی پوری برادری اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گی جب تک کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو جائے۔

اجلاس میں دیگر قراردادوں کے علاوہ روزنامہ صداقت کے ایڈیٹر بشیر احمد رانا اور پرنٹر افتخار حسین کی گرفتاریوں کی بھی شدید مذمت کی گئی اور انتظامیہ کو تنبیہہ کی کہ وہ ان اقدامات سے اخباری کارکنوں کو مشتعل کرنا چاہتے ہیں۔

گذشتہ ایک ہفتے میں روزنامہ مساوات کے دفتر میں ہلال پاکستان، نصرت، اور مساوات کے کارکنوں کا روزنامہ مشرق کے دفتر میں ہفت روزہ معیار، الفتح اور مشرق کے کارکنوں کا اور ہیرالڈ پبلیکیشن کے مرکزی دفتر میں حریت ڈان اور ملت کے ملازمین کے اجلاس ہو چکے ہیں۔ ان جلسوں میں ایمپنک کراچی اور کے یو جے کے عہدیداروں کے علاوہ فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور ایمپنک کے چیرمین منہاج برنا نے شرکت کی اور صحافیوں کی حالیہ جدوجہد کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اخباری کارکنوں کے ملک گیر مسائل پر اجتماعی جدوجہد کی ضرورت کا احساس دلایا۔

OO

بنگلہ دیشی صحافیوں کا وفد کراچی پریس کلب میں

صحافی جو کل تک اٹھتے بیٹھتے کھاتے وہی پیتے، شریک محفل ہوا کرتے تھے شانہ بہ شانہ جدوجہد میں شریک ہوتے تھے۔ "ایک المیئے" کے بعد جو مہمان بن کر کراچی پریس کلب آئے تو بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں

بنگلہ دیش کے پانچ رکنی صحافیوں کا وفد جو بنگلہ دیش کے سیکرٹری اطلاعات قاضی اطہر علی کی قیادت میں مختصر دورے پر ۱۴ اپریل کو کراچی آیا تھا ۱۵ اپریل کی شام کو کراچی پریس کلب میں بھی خصوصی طور پر مدعو تھا پریس کلب کے سیکرٹری نے بنگلہ دیشی صحافیوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا کہ صحافی چاہے کسی ملک کا بھی ہو وہ انسانیت اور انصاف کے عالمگیر رشتے میں ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے۔ سقوط مشرقی پاکستان نے وقتی طور پر ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا مگر اب حقیقتوں کو تسلیم کرنے کا زمانہ ہے۔ بنگلہ دیشی صحافیوں کے پاکستانی صحافیوں سے رابطے جتنے مضبوط بنیادوں پر استوار ہوں گے پاکستان اور بنگلہ دیش میں دوری کی خلیج اسی قدر جلد پاٹی جا سکے گی۔

بنگلہ دیش کے سیکرٹری اطلاعات نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان دوستی کے مضبوط رشتے بتدریج مضبوط بنیادوں پر قائم ہو رہے ہیں انہوں نے برطانوی سامراج سے نجات حاصل کرنے کے لئے دونوں ملکوں کے عوام کی مشترکہ جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اب ہمیں اپنی معیشت کو مستحکم کرنے اور دوستی کو فروغ دینے کا موقع ملا ہے۔ پاکستانی صحافیوں کو بنگلہ دیش کا دورہ کرنے کی دعوت دیتے ہوئے قاضی مظہر علی نے کہا کہ ہمارے ملک کے صحافی اپنے پرانے دوستوں سے ملنے کے بے حد خواہش مند ہیں

تقاریر کی رسمی تقریب کے بعد چائے کی میز پر بنگلہ دیشی صحافیوں نے ذرا کھل کر تبادلہ خیال کیا۔

OO

پاکستان کے معاشرے پر مارشل لاء کے اثرات

سیاسی، فوجی اور مارشل لاء کی قوتوں کا امتزاج طاقت کا

ہیبتناک مجموعہ کہلائے گا

ممتاز قانون دان اعجاز حسین بٹالوی کے مارشل لاء کے بارے میں خیالات

پاکستان کے معاشرے پر مارشل لاء کے اثرات کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں مارشل لاء کی صورتحال کے بارے میں اپنے ذاتی ردِّ عمل کا اظہار کردوں۔ میری دانست میں کسی ترقی پذیر معاشرے کی یہ سب سے بڑی بدنصیبی ہوتی ہے کہ وہاں مارشل لاء نافذ ہو جائے۔ اپنی آزادی کے بعد خطۂ پنجاب تین بار اور پاکستان دو مرتبہ اس صورتحال سے دوچار ہو چکا ہے۔ لازم ہے کہ اس امر کا تجزیہ کر لیا جائے کہ مارشل لاء نافذ کرنے والوں کے بلند بانگ دعووں کے باوجود اس صورتِ حال سے معاشرے پر کیا گذری۔ اور نفع نقصان کے میزانیئے میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ کیا حالات تھے جو مارشل لاء کے لئے وجۂ جواز بنے اور وہ کیا سیاسی اسباب تھے جن کو مارشل لاء کے لئے استعمال کیا گیا۔

بیسویں صدی کا نصف آخر، جس میں ہم زندہ ہیں، تاریخ انسانی کا ایک اہم دور ہے۔ یہاں تکنیکی اور سائنسی ترقیوں اور ایجادوں کا تذکرہ مقصود نہیں البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ نصف صدی کے اس دور میں دنیا کے بیشتر حصوں بالخصوص ایشیا اور افریقہ کے برِّ اعظموں میں نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہوا اور مغربی استعمار کی استحصال پسندی کا جنازہ نکلا۔ یہ دنیا کی نئی آزادیوں اور تیسری دنیا کے طلوع کی صدی ہے۔ تیسری دنیا کے یہ نوآزاد ممالک آئے دن مارشل لاء کی اسی صورتِ حال سے دوچار رہتے ہیں۔ ایسی خبریں پڑھنا اب قاری کے لئے ایک معمول ہو چکا ہے کہ آج ایشیا کا یہ ملک اپنی ہی فوج کے قبضے میں چلا گیا اور کل افریقہ کا وہ ملک کسی جرنیل یا کرنیل کی نذر ہو گیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ مارشل لاء لگنے پر جب نئی حکومت کا سربراہ اپنی افتتاحی تقریر کرتا ہے تو اخبار پڑھنے والے کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ تقریر تو پہلے بھی کہیں پڑھ چکا ہے۔ گذشتہ پچیس تیس برسوں میں ان تقریروں کے الفاظ، ان کی گھن گرج، ان کا لہجہ، ملک کی زبوں حالی، مارشل لاء کے نفاذ کی ضرورت اور اصلاحات کے دور کا آغاز، یہ سب کچھ دنیا کے مختلف حصوں میں اتنے فوجی آمروں نے اتنی مرتبہ دہرایا ہے کہ اب اخبار پڑھنے والے اسکول کے بچوں کو بھی ایسی تقریریں لکھنے کی مشق ہو چکی ہوگی۔

لیکن المیے کی بات یہ ہے کہ اس کا وقفہ دو برس کا ہو یا دس برس کا، جب وہ آمر رخصت ہوتا ہے تو اس کے ملک کی حالت، جس کی اصلاح کے لئے اس نے یہ زحمت گوارا کی تھی، پہلے سے زبوں تر ہو چکی ہوتی ہے۔ دور کیوں جایئے، پاکستان میں اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خان کی تقریروں کی گونج ابھی آپ کے ذہنوں میں موجود ہوگی۔ اور ۱۹۶۹ء والے مارشل لاء کے موقع پر جنرل یحییٰ خاں کی تقریر تو ابھی کل کی بات ہے کیسی دردناک بات ہے کہ ایوب خاں نے جس صورتِ حال کی اصلاح کا بیڑہ اٹھانے کے لئے مارشل لاء نافذ کیا تھا وہ ایک اور مارشل لاء پر منتج ہوئی اور اس دوران میں پاکستان کا معاشرہ بطور ایک نامیاتی کل کے کسی اصلاح کے بجائے مزید زبوں حالی کا شکار ہو چکا تھا۔

۱۹۵۳ء میں پنجاب میں مقامی سیاست دانوں کی آویزش اور صوبائی قیادت اور مرکزی کابینہ کے باہمی تعلقات نے ایک ایسی افسوسناک صورت حال پیدا کر دی تھی کہ پنجاب کے صوبے میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا تھا۔ اس موقع پر پاکستان کی مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے میاں افتخار الدین مرحوم نے ایک پتے کی بات کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا:

"جناب والا! اس موقع پر مجھے وہ حکایت یاد آتی ہے جو پنجاب میں بہت عام ہے یہ حکایت میراثیوں کے ایک کنبے کے بارے میں ہے، جن کی ایک پڑنانی سو سال سے زائد عمر میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ کسی شخص نے کنبے کے لوگوں کو روتے پیٹتے دیکھا تو کہا: 'کیوں، آخر تو بڑی بی سو سال سے اوپر کی تھیں پھر اس قدر کیوں روتے ہو؟' جواب ملا: 'ٹھیک ہے' ان کی عمر سو سال سے زیادہ تھی، لیکن رونا تو یہ ہے کہ عزرائیل نے گھر دیکھ لیا ہے۔ اب وہ کسی اور کے لئے بھی آ سکتے ہیں'۔ اس طرح مجھے ڈر یہ ہے کہ ان لوگوں نے کسی غیر ذمہ دار قیادت کو راستہ دکھایا ہے۔ انہوں نے مارشل لاء نافذ کر کے اور اس طرح کے طریقے اختیار کر کے طاقت کے ذریعے حکومت کی تبدیلی کا راستہ دکھا دیا ہے۔"

یہ تقریر ۲۸ مارچ ۱۹۵۴ء کو قومی اسمبلی میں کی گئی اور اس کے ساڑھے چار سال بعد، ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی شام کو چند مرکزی وزراء کراچی میں سکندر مرزا کے قصرِ صدارت میں جمع تھے۔ نائو نوش کی محفل جاری تھی صدر

مارشل لا کی نحوست ایٹم بم کے دھوئیں کی طرح کثیف ہے

سکندر مرزا ان کا ساتھ بھی دے رہے تھے اور بار بار گھڑی کی جانب بھی دیکھ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ تھوڑی دیر میں فوجی دستے اپنے پہلے سے مقررہ شدہ مقامات سنبھالنے کے لئے رخصت ہونے والے ہیں۔ خدا خدا کر کے یہ مہمان آٹھ بجے کے قریب رخصت ہوئے ساڑھے آٹھ بجے کے قریب فوجی دستوں کا مارچ شروع ہوا اور گھنٹے بھر کے اندر اندر انہوں نے اپنے اپنے مقررہ مقامات سنبھال لئے۔ بارہ بجے شب سے تھوڑی دیر بعد اسکندر مرزا کی جانب سے آئین کی منسوخی، مارشل لاء کے نفاذ اور مارشل لاء کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے جنرل ایوب خان کے تقرر کا اعلان ہوگیا۔ جمہوری ادارے اور جمہوری روایتیں بیک جنبشِ قلم ختم کردی گئیں اور وزارتیں اور اسمبلیاں حرفِ غلط کی طرح مٹ گئیں۔

۲۷ اکتوبر کو جب جنرل ایوب خان نے اسکندر مرزا کو رخصت کر کے صدر پاکستان کا عہدہ بھی سنبھال لیا تو ان کی ذات میں طاقت کے تین سرچشمے مجتمع ہوگئے وہ پاکستان کے صدر مملکت بھی تھے وہ افواج پاکستان کے سپریم کمانڈر بھی تھے اور مارشل لاء کے ناظم اعلےٰ بھی تھے۔ قانون کی زبان میں کسی فرد واحد کی ذات میں یہ سیاسی، فوجی اور مارشل لاء کی قوتوں کا امتزاج، طاقت کا ہیبت ناک مجموعہ کہلائے گا۔ میری ناچیز رائے میں اتنی طاقت کسی ایک فرد یا کسی ایک ادارے میں جمع ہو جاتی ہے تو اس سے خیر و برکت کے چشمے نہیں پھوٹتے:۔

ABSOLUTE POWER CORRUPTS

ABSOLUTELY۔

طاقت کو ہر CORRUPTION سے بچانے کے لئے جو چیزیں لازمی درجہ رکھتی ہیں وہ جمہوری ادارے ہیں، طاقت کی مساویانہ تقسیم ہے، قانون ساز اداروں کے سامنے اربابِ حکومت کی جوابدہی کی روایت ہے، آزاد صحافت اور کھلی تنقید ہے، آزاد عدلیہ ہے اور سب سے بڑھ کر رائے عامہ اور عوام کا یہ حق کہ وہ حکومت کے کاموں پر جب چاہیں تنقید کریں اور اس تنقید کو دوسروں تک پہنچائیں اور دوسروں کو اس میں شامل کرلیں۔

مارشل لاء کی زد سب سے پہلے انہی اداروں اور انہی روایتوں پر پڑتی ہے۔ عدلیہ کی آزادی چھن جاتی ہے اخباروں کی آزادگوئی ختم کردی جاتی ہے، تنقید کرنے والی زبانیں گنگ کردی جاتی ہیں اور رائے عامہ کو ایک بے معنی اور لاحاصل چیز سمجھا جانے لگتا ہے۔

پاکستان میں مارشل لاء کے نافذ ہونے پر بھی کچھ ہوا۔ سب سے پہلی زد عدلیہ کی آزادی پر اور دوسری زد پریس کی آزادی پر پڑی۔ مارشل لاء کے نفاذ کے تھوڑے عرصے بعد مارشل لاء حکومت کے دو وزیر جن میں سے ایک فوجی اور ایک غیر فوجی تھے، پاکستان کی افسر شاہی کے ایک منجھے ہوئے افسر کو ساتھ لے کر لاہور آئے اور فوج اور پولیس کے چند دستوں کے ساتھ پروگریسو پیپرز کے دفاتر کو اس طرح گھیرا جیسے کوئی مورچہ فتح کرنا مقصود ہو۔ ایک حکم نامے کی رو سے ان دو روزناموں اور اخباروں کو مارشل لاء کی حکومتی تحویل میں لے لیا گیا ہرچند کہ اگلی صبح کو یہ روزنامے اسی وقت شائع ہوئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ دن جائے اور آج کا دن آئے، ان اخباروں کو وہ آزادی نصیب نہ ہوئی جو ان کا طرۂ امتیاز تھی۔ اس کارروائی کو دیکھ کر باقی اخباروں نے عبرت پکڑی اور اپنی اپنی منقاریں پروں کے نیچے کرلی۔

ارد گرد دیکھتا ہوں تو مجھے آج کے پاکستانی اخبار بھی سرمہ در گلو معلوم ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ مارشل لاء کا ہول دلوں پر بیٹھ جائے تو آسانی سے نہیں اٹھتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مارشل لاء محض ایک جابرانہ نظام کا نام نہیں، ایک طرح کی ذہنی عادت کا نام ہے اور عادت کا تو یہ معاملہ ہے کہ ایک دفعہ پڑ جائے تو آسانی سے جانے کا نام نہیں لیتی۔ بعض دفعہ تو انسان کو خارجی تبدیلیوں کا احساس اور ادراک بھی نہیں ہوتا۔ ادھر چند مہینے پہلے میں نے ایک ایسے جاپانی سپاہی کی خبر پڑھی تھی جو ابھی تک جنگلوں میں چھپا ہوا دوسری جنگ عظیم لڑتا جا رہا تھا اور یہ اطلاع کہ جاپان ہار گیا اور جنگ ختم ہو چکی، ابھی تک اسے معلوم نہ ہوئی تھی۔

بات یہ ہے کہ مارشل لاء ذہنی آزادی کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔ اگر زبان اور قلم کی آزادی چھین لی جائے تو آہستہ آہستہ ذہن کی آزادی بھی ماؤف ہونے لگتی ہے۔ ہماری نسل کے ساتھ بھی یہی حادثہ ہو چکا ہے۔ پے بہ پے لگنے والے مارشل لاؤں نے ہمارے ذہنوں پر ڈر اور ہیبت کے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ہم آزادی سے سوچنے اور آزادی سے بات کرنے کی خوبصورت اور نڈر عادتوں کو فراموش کر چکے ہیں۔ اس بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لانے کے لئے بہت محنت کرنا پڑے گی۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی ذمہ داری موجودہ جمہوری حکومت کی ہوگی۔

ہندوستان کے ٹیلی ویژن سے مجھے فلمیں دیکھنے کا اتفاق تو نہیں ہوا البتہ چند مرتبہ میں نے ان کے ہاں سے ہندوستان کے قومی مسائل پر وہاں کے لکھنے والوں اور سوچنے والوں کے مذاکرے اور مباحثے ضرور دیکھے ہیں۔ اپنی حکومت پر بے باک تنقید سن کر منہ میں پانی بھر آتا ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ یہ جو واگہے کی سرحد کے اس پار مارشل لاء نہیں لگا، اس سے سرحد کے اُس طرف میرے ہم عصروں کی کتنی جاندار روایتیں نہ صرف زندہ رہ گئیں بلکہ آزادی کی فضاؤں میں اور پروان چڑھیں۔

مارشل لاء کا یہ منحوس جادو معلوم نہیں اور کتنے برسوں تک ہمارے ذہنوں پر قبضہ جمائے رکھے گا۔ مارشل لاء کی نحوست ایٹم بم کے دھوئیں کی طرح ہے کہ ایک نسل کو لگ جائے تو لہو کے راستے دوسری نسل تک پہنچ جاتی ہے۔

پرسوں شادی کی ایک محفل میں مجھے لاہور کے ایک مشہور صحافی مل گئے، جو اتفاق سے میرے دوست اور کالج کے ہم عصر بھی ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا: "خدا کو حاضر ناظر جان کر بتایئے کہ یہ جو مارشل لاء لگتے رہے ان کا آپ پر کیا اثر ہوا؟" وہ بولے "میں نے جب صحافت کا پیشہ اختیار کیا تو میں نوجوان تھا طبیعت میں امنگ تھی، جوش تھا، ولولہ تھا۔ بڑے بڑے کام کرنے کو جی چاہتا تھا۔ ملک کی نئی نئی آزادی کی

باقی صفحہ ۵۰ پر

یونان

میں جمہوریت کے قتل کی کہانی

آندرے پاپاندریو کی زبانی

فوجی جنتا مجھے مار ڈالنا چاہتی ہے

میں جیل میں فردِ جرم عائد کئے جانے کا منتظر تھا میرا تعلق صرف دن اور دن کے معمولات سے رہ گیا تھا۔ مختلف دنوں کے درمیان بس ایک یہی فرق رہ گیا تھا کہ آیا وہ دن کسی سے ملاقات کا ہے یا نہیں، مجھے تھوڑی دیر کے لئے کوٹھڑی سے باہر بھی نکالا جاتا۔ اس وقت میں تنہا برامدے میں ٹہلا کرتا اکثر کپتان، لیفٹننٹ، یا وارنٹ افسر بھی میرے ساتھ ساتھ ٹہلا کرتے۔ اس دوران ہم بڑی آزادی سے گفتگو کرتے لیکن یہ باتیں سیاسی نہ ہوتیں کیونکہ سیاسی باتیں ممنوع تھیں، ہم باتیں کرتے کرتے خانہ جنگی کے موضوع تک پہنچ جاتے کپتان اور وارنٹ افسر میرے ہم عمر تھے۔ وہ گوریلوں سے لڑ چکے تھے، ان کے ذہن میں تلخ یادیں موجود تھیں جنہیں وہ چھپاتے نہیں تھے، لیفٹننٹ بہت ہی کمسن تھا اور اسے صرف اپنی معاشی ترقی سے غرض تھی۔ جولائی کا مہینہ تھا میں برامدے میں ٹہل رہا تھا۔

سیاستدان قطعی اس قابل نہیں ہیں کہ امورِ مملکت چلا سکیں

میرے دوست بھی فوجی آمریت کے خلاف

کھڑکی سے جھانک کر صحن کی طرف دیکھا تو دو ریر تین دوست کھڑے نظر آئے ان میں ایک میرا سکریٹری انٹونیس دوسرا میرا ایک قریبی دوست اور کبھی نہ منعقد ہونے والے انتخابات کا ایک امیدوار ساکیس اور تیسرا میرے ضلع کا ایک ڈپٹی (پارلیمنٹ کارکن) ٹاکیس تھا انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ لیکن کس الزام کے تحت؟ ان لوگوں نے بھی میری طرف دیکھا اور کافی فاصلہ ہونے کے باوجود مجھے پہچان کر میری طرف اشارہ کیا، لیکن جیل کے گارڈ نے انہیں فوراً ہی اندر کی طرف بھیج دیا۔

دوسرے دن میں نے اپنے وکیل مینیوز سے ان کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ بہت سارے لوگوں کے ساتھ انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا ہے کیونکہ مزاحمت کرنے والے گروپ میں یہ بھی شریک تھے۔ دراصل ان پر گروپ لیڈر ہونے کا شبہ کیا گیا تھا، گروپ کے کچھ لوگوں کو جن میں ساکیس بھی شامل تھا اذیتیں بھی دی گئی تھیں اور ان پر بڑا دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ میں نے فخر بھی محسوس کیا اور تشویش بھی فخر اس لئے کہ میرے قریبی دوست جنگ میں شریک تھے اور تشویش اس لئے کہ وہ بہت زیادہ محتاط نہیں رہے تھے۔ تاہم یہاں ان کی موجودگی کے باعث مجھے اپنی تنہائی کا احساس کم معلوم ہونے لگا۔ ان دبیز دیواروں کے پیچھے میرے دوست بھی موجود تھے۔

مارگیرٹ مجھ سے ملنے کے لئے برابر آیا کرتی تھی، ایک دن جو وہ اپنے وقت پر نہیں آئی تو مجھے تشویش ہونے لگی کہ کہیں وہ بھی تو گرفتار نہیں ہو گئی۔ میں نے باہر کی طرف جھانک کر دیکھا تو مارگیرٹ کی ایک دوست نظر آئی۔ جو ایٹنس کی تھی اور مارگیرٹ کے ساتھ ہی ٹھہری ہوئی تھی اس نے مارگیرٹ کو کافی اخلاقی سہارا دے رکھا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر مطمئن رہنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد مارگیرٹ بھی نظر آئی لیکن وہ تنہا نہیں تھی اس کے ساتھ والٹر ہیلر بھی تھا جو مینی سوٹا (امریکہ) میں میرا دوست اور رفیق کار رہ چکا تھا۔ بڑا اچھا ماہر اقتصادیات اور اپنی صلاحیتوں کی بنا پر صدر کینیڈی اور صدر جانسن کا مشیر بھی رہ چکا تھا، اس نے ہاتھ ہلا کر میری طرف اشارہ کیا۔ میں نے بھی جواب میں ہاتھ ہلایا دوسرے دن والٹر مجھ سے ملنے آیا وہ تنہا نہیں تھا، اس کے ساتھ کیپٹن ٹور ناس اور امریکی سفارت خانے کا ایک ترجمان بھی تھا۔ ہم دونوں نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملائے اور اس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ گئے جس میں اپنے وکیل سے ملا کرتے تھے وہ اس امید پر یونان آیا تھا کہ کرنلوں کو مجھے ملک بدر کرنے پر آمادہ کر سکے گا تاکہ مغرب سے ان کے تعلقات کی راہ کا کانٹا ہٹ جائے اس سلسلے میں وہ کولیاس، پیٹاکوس مکاریزوس اور امن عامہ کے وزیر ٹوٹومیس سے مل چکا تھا بعد میں امریکہ جا کر اس نے وہ باتیں لکھیں جو اس نے اس دن مجھ سے کہی تھیں۔

اس نے جو کچھ لکھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس نے فوجی جنتا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ آندریے پاپاندریو کمیونسٹ نہیں ہے تاہم اگر اسے ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہو تو اسے جلاوطن کر سکتے ہیں وہ اس سے چھٹکارا حاصل کر لیں لیکن فوجی جنتا کے ممبروں نے سخت لائن اختیار کی اور وہ اپنے آپ کو حق بجانب ٹھہرانے کے لئے آندریے پاپاندریو پر مقدمہ چلانے پر ہی مصر رہے انہوں نے کہا کہ معاملہ عدالت میں ہے اس لئے مقدمہ ضرور چلے گا۔

میری جلاوطنی کے امکانات کا ہر طرف چرچا ہونے لگا خاص طور پر اس لئے کہ میں صرف یونانی ہی نہیں۔ بلکہ امریکی شہریت بھی رکھتا تھا، لیکن یہ مفروضہ غلط تھا کیونکہ اپنی امریکی شہریت سے میں یکم جنوری ۱۹۶۴ء ہی کو دستبردار ہو چکا تھا یونان کی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کرنے کے بعد میں دوہری شہریت نہیں رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے یونان میں امریکی سفیر کو جا کر اپنے اس، فیصلے سے سرکاری طور پر مطلع کر دیا تھا، ادھر میرے وکیل کو معلوم ہوا کہ جنتا مجھ سے کھلے بندوں تصادم سے گریز کا کوئی قانونی جواز ڈھونڈ رہی تھی چنانچہ میری دوہری شخصیت کے متعلق بھی اس نے جانچ پڑتال کرا کر یہ معلوم کر لیا تھا کہ میں اپنی امریکی شہریت بہت پہلے ہی ختم کر چکا ہوں۔ بہر حال اب انہیں کڑوا گھونٹ پینا ہی تھا کیونکہ وہ مجھے بلا مقدمہ چلائے ہمیشہ نظر بند تو رکھ نہیں سکتے تھے خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ میری ذات سے بین الاقوامی دلچسپی کا سلسلہ قائم ہو گیا تھا اور بیرونی ملکوں میں میرے متعلق رائے زنی ہونے لگی تھی اور فوجی حکومت دنیا کو یہ باور کرانے پر تلی ہوئی تھی کہ وہ جو کچھ کر رہی ہے قانونی دائرے میں رہ کر کر رہی ہے۔

والٹر کو یقین تھا کہ فوجی حکومت مجھ پر ضرور مقدمہ چلائے گی اور مقدمہ ختم ہونے کے بعد کوئی نہ کوئی عذر تراش کر مجھے ملک بدر کر دے گی، والٹر نے فوجی حکمرانوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ میں جلاوطن ہونے کے بعد سیاست سے الگ ہو کر علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہو جاؤں گا چنانچہ فوجی انقلاب کے بعد مجھے علمی کاموں کے لئے اُسے مجھ سے متعلق بہت سی پیشکش بھی موصول ہونے لگی تھیں

والٹر نے یہ ساری باتیں فوجی
علمی حیثیت اجاگر کرنے کی
والٹر کے جانے کے
اور جو باتیں والٹر نے مجھے بتائ
تو وہ بڑی آزردہ ہوئی۔ مارگ
تھی کہ والٹر میرے لئے کچھ ک
باتیں معلوم ہوئیں خاص طو
کو مجھ سے شدید نفرت ہے
ہو جاتا ہے تو اسے بڑی مای
ہوئے کہا کہ کولیاس فریڈر
غنیمت ہے کہ اس نے
اس کے لئے مجھے قتل کرا د
اگست کے اوائل کی
وزیر امور داخلہ اور ٹوٹومیس
ملنے چلے آئے، انہوں نے آ
کی کوٹھڑی میں چل کر کچھ باتیں
انہیں لے کر اپنی کوٹھڑی
مجھ سے میری صحت کا حا
"آپ کو ہم سے کچھ کہنا ہے
ان کا یہ دورہ اور پھر یہ سوال
بھونچکا رہ گیا۔ بالآخر میں
پوچھتے ہیں تو وہ بس یہی ہے
روزانہ اس کمرے میں ملنے د
وکیل سے ملتا ہوں۔"
یہ سن کر ٹوٹومیس پہلی مر
"ہم اس کی اجازت نہیں دے

جنگ میں شریک تھے

ـرانوں پر دباؤ ڈالنے اور میری
ـں سے کہی تھیں۔
ـد جب مارگیرٹ مجھ سے ملی
ـھیں وہ میں نے اسے بتائیں
ـرٹ نے یہ امید باندھ رکھی
ـجائے گا لیکن جب اسے یہ
ـر جب اس نے سنا کہ گویا اس
ـر وہ میرا نام سنتے ہی غضبناک
ـسی ہوئی میں نے اسے سمجھاتے
ـں کا آدمی ہے لہذا اتنا بھی
ـھے زندہ چھوڑ رکھا ہے ورنہ
ـنا بھی کوئی مشکل نہیں تھا۔
ـں بات ہے ایک دن پٹاکوس
ـوزیر امن عامہ اچانک مجھ سے
ـتے ہی مجھ سے کہا کہ ہم آپ
ـں کرنا چاہتے ہیں چنانچہ میں
ـں چلا آیا۔ پٹاکوس نے پہلے
ـل پوچھا اس کے بعد کہنے لگا
ـسی خواہش کا اظہار کرنا ہے؟
ـں اس قدر اچانک ہوا تھا کہ میں
ـنے کہا" اگر آپ میری خواہش
ـے کہ میری بیوی کو مجھ سے
ـدیا جائے جس میں میں اپنے

ـرتبہ بڑی سرد مہری سے بولا
ـے سکتے کیونکہ ہمیں شبہ ہے

کہ آپ اپنی بیوی کے ذریعہ اپنے سیاسی دوستوں کے ساتھ پیغام رسانی کا سلسلہ شروع کردیں گے۔"

"اگر میں ایسا کروں تو مجھ سے بڑا بیوقوف اور کون ہوگا کیونکہ اس طرح میں اپنی بیوی کی آزادی کو خطرے میں ڈال دوں گا جب کہ ابھی خاندان کی دیکھ بھال وہی کررہی ہے۔" ٹوٹومس کا رویہ سخت ہوتا گیا اس نے کہا "یہ نہ بھولئے کہ آپ کی بیوی ہمارے قومی معاملات میں مداخلت کرنے لگی ہے۔ کیا اس نے مسز جانسن کو خط نہیں لکھا؟ اس کو ایسا کرنے کا کیا اختیار تھا؟ آپ کی بیوی ہماری قوم کی دشمن ہے۔"

ٹوٹومس خاموش ہوا تو پٹاکوس کہنے لگا۔ "آپ کے سیاسی افراد قطعی اس قابل نہیں کہ امور مملکت چلا سکیں آپ لوگوں نے سرکاری خدمات سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے آپ کے تمام آدمیوں نے دولت حاصل کی ہے۔

مجھے بھی غصہ آگیا میں نے کہا "تمام لوگ کی بات تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن اپنے متعلق تو میں وثوق کے ساتھ آپ کی تردید کرسکتا ہوں۔ آپ فوجی آدمی ہیں اور میں نے سنا ہے کہ فوج کے آدمیوں میں دوسروں کی عزت نفس کا خیال ہوتا ہے اگر آپ مجھے واقعی ایسا سمجھتے ہیں جیسا کہ کہہ رہے ہیں تو پھر آپ کا یہ فرض ہے کہ ہم پر مقدمہ چلائیں۔ تمام سرکاری فائلیں آپ کے قبضے میں ہیں۔ میرے خلاف ثبوت فراہم کیجئے اور مجھے فوجی عدالت میں پیش کردیجئے اور اگر ایسا نہیں کرتے تو میں مطالبہ کروں گا کہ اپنے الفاظ واپس لیں۔"

اب پٹاکوس کچھ نرم پڑگیا اس نے نرمی ہی سے

فوجی حکومت قانون کا سہارا لیکر ہی سب کچھ کر رہی تھی

کہا۔ میرا مطلب یقینی طور پر آپ سے نہیں تھا لیکن آپ کے قبیل کے لوگوں سے متعلق تو میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ملک کو چلانے کی صلاحیت صرف فوج کے اندر ہے۔"

"تو پھر انجینئر کیوں نہیں چلا سکتے؟" میں نے پوچھا۔ وہ اس بات سے خفا ہوکر بولا۔ اس لئے کہ وہ آپ سے بھی گئے گزرے ہیں۔"

اس طرح یہ ملاقات ختم ہوگئی وہ اٹھے اور چلے گئے۔ لیکن آج تک اس ملاقات کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔

اسی دن پٹاکوس نے ایک پریس کانفرنس میں میرے متعلق سخت بیمار ہونے کا اعلان کردیا۔ ایک صحافی پریس کانفرنس سے نکل کر سیدھے میری بیوی مارگریٹ کے پاس یہ معلوم کرنے کے لئے پہنچا کہ کیا یہ رپورٹ صحیح ہے پٹاکوس کی اس حرکت کا مطلب میری بیوی کی سمجھ میں یہی آیا کہ اس طرح فوجی حکمران مجھے ملک بدر کرنے کی راہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مینوز اس حرکت پر پریشان ہوگیا کیونکہ اس نے یہ سمجھا کہ فوجی جنتا مجھے

جیل میں ایک روز وزیر داخلہ مجھے ملنے چلا آیا

۔۔۔ ڈالنا چاہتی ہے اور بیماری کو میری موت کا سبب بتانا چاہتی ہے۔ میتیوز وزیر انصاف سے احتجاج کرنے کو سوچ ہی رہا تھا کہ پٹاکوس نے ایک اور بیان دے دیا جس میں اس نے کہا کہ آندرے کی صحت پہلے سے بہتر ہو گئی ہے اور اب کوئی تشویش کی بات نہیں۔ اس نے پریس کانفرنس کے دوران ہی مجھے فون پر طلب کر کے کہا "پریس والے مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ آپ ایو پروف سے نکل بھاگے ہیں کیا یہ صحیح ہے؟"

مجھے سخت حیرت ہوئی۔ میں نے کہا "میں تو اس وقت آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔"

یہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ خیر اس وقت آپ کی صحت کیسی ہے اب آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟"

"میں بالکل صحیح و سالم ہوں۔"

یہی بات میں پریس والوں سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کی صحت بالکل ٹھیک ہے۔ اچھا اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کی فرد جرم کب تک تیار ہو رہی ہے۔"

میں سخت حیرت میں پڑ گیا۔ مجھے بھلا کیا معلوم کہ یہ کب تک تیار ہو گی۔ میں نے کہا کہ یہ جاننا تو آپ لوگوں کا کام ہے۔ وزارت انصاف بتا سکتی ہے۔ میں کیا بتاؤں مجھے میرے وکیل نے صرف اتنا بتایا ہے کہ یہ کسی دن بھی تیار ہو سکتی ہے۔

پھر پٹاکوس نے بتایا کہ ایو پروف (ایک سابق وزیر خارجہ) کا کورٹ مارشل ہو گیا اور اسے پانچ سال کی سزائے قید ہوئی ہے۔ "کیا اسے بھی آپ ہی کی جیل میں لے جایا گیا ہے؟" اس نے پوچھا اور مجھے اس کے اس سوال پر بھی حیرت ہوئی۔ آخر اس نے مجھے کیا سمجھ رکھا تھا۔ میں کوئی جیل کا ملازم تھوڑی ہی تھا کہ مجھے یہ سب کچھ معلوم ہوتا۔ بہر حال یہ بات چیت یہیں پر ختم ہو گئی۔

فرد جرم کا میں چار ماہ سے انتظار کر رہا تھا۔ اس طویل تاخیر کا سبب میتیوز کی اور میری سمجھ میں قطعی نہیں آ رہا تھا۔ ہم بس اتنا ہی جانتے تھے کہ اس سلسلے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کے پاس کوئی ثبوت تو تھا نہیں پھر بھی وہ فرد جرم عائد کرنے پر مجبور تھے کیونکہ وہ مجھے مقید رکھنے کو حق بجانب کیونکر ٹھہرا سکتے تھے بلکہ خود ان کے انقلاب کا بھی کوئی جواز نہ رہ جاتا آخر کار یہ فرد جرم آئی لیکن یہ ایک افسوسناک دستاویز تھی۔ یہ اس سے مختلف نہیں تھی جو چند ماہ پہلے چند مٹھی بھر افسروں کے خلاف جاری کی گئی تھی اور جس کے تحت ان پر مقدمہ چلا کر انہیں سزائیں دی گئی تھیں۔ اس سے فوجی جنتا کی بھی بڑی حد تک پسپائی ہوئی کیونکہ وہ مشہور خط جو میرے والد نے مبینہ طور پر پاپا ترپوس کو لکھا تھا، جعلی ثابت ہو گیا تھا ماہرین نے متفقہ طور پر اسے جعلی قرار دے دیا تھا اب اس فرد جرم میں مجھ سے یہی سطحی جرائم منسوب کئے گئے تھے کہ میں نے ایک انقلاب برپا کرنے کی سازش کی تھی لیکن اس کے لئے نہایت ہی بودی دلیلیں پیش کی گئی تھیں اسے دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی۔ اب ہماری خواہش تھی کہ معاملہ جلد از جلد عدالت میں پہنچ جائے میرے علاوہ دس اور ملزم بھی تھے۔ ان میں سے بہتوں نے چاہا کہ اس کے خلاف اپیل کریں۔ گویا مزید تاخیر کا سامان کیا جا رہا تھا۔

○○

پاک چین تعلقات

بھارت چین تعلقات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی روشنی میں

ایک سفارتی مبصر کے قلم سے

”چین نے پاکستان کو ہتھیار سرحدوں کے دفاع کے لئے دیئے تھے، نہ کہ اپنے ہی عوام کو کچلنے کے لیے“

اس پس منظر کے ساتھ صدر ذوالفقار علی بھٹو نے جنوری ۱۹۷۲ء کے آخر میں پیکنگ کا دورہ کیا۔ انہوں نے چیئرمین ماؤزے تنگ کے ساتھ ایک اہم ملاقات کی اور وزیراعظم چواین لائی سے سلسلہ وار بھرپور بحث و تمحیص ہوئی۔ مسلسل تعاون کی بنیاد پر باقاعدہ بحث ہوئی اور ایک دوسرے سے اتفاق رائے ہوا۔ پالیسی اور اصول وضع کئے گئے اور اس طرح طے کئے گئے کہ دونوں رہنماؤں کے اطمینان کے مطابق فضا ساز گار ہو جائے۔ مذاکرات تسلی بخش اور خوشگوار فضا میں انجام کو پہنچے۔ حقیقی اور پہلے والا اعتماد بحال ہوا۔ آمد کے وقت ماحول مختلف تھا۔ دوستانہ تھا مگر بڑا محتاط۔ پاکستان کے مکمل وفد سے پہلی ملاقات میں اور چند پاکستانی صحافیوں کی موجودگی میں۔ وزیراعظم چواین لائی نے صدر پاکستان اور ان کے وفد کے ارکان کا خیر مقدم کرتے ہوئے خاص طور پر اس بات کو واضح کیا کہ چین نے پاکستان کو ہتھیار اس لئے دیئے تھے کہ وہ اپنی سرحدوں کا دفاع کرے نہ کہ اپنے ہی عوام کے خلاف استعمال کئے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ یحییٰ خان سے کہتے رہے کہ وہ صحیح اور مناسب فیصلے کریں لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ نتیجہ یہ کہ آپ کو بھی نقصان ہوا، ہمیں بھی۔ پہلی رسمی اور باقاعدہ ملاقات کا لہجہ یہ تھا۔ اور آخری ملاقات

چین کے خیر سگالی وفد کا پاکستان اور بھارت کا بیک وقت دورہ کرنا معنی خیز ہے

میں لہجہ وہی پرانے اچھے دنوں والا تھا۔ جب جموں اور کشمیر کا مسئلہ گفتگو کا اصل موضوع ہوتا تھا۔

"کشمیر پر آپ کی پالیسی اب کیا ہوگی؟" وزیر اعظم چو این لائی نے پوچھا۔

"وہی۔ بالکل وہی۔" صدر پاکستان کا جواب تھا۔

"وزیر اعظم چو این لائی نے پر از تحسین لہجے میں کہا۔ "میں نے آپ کے اعتماد کو ہمیشہ پسند کیا ہے۔ آپ نے اپنے آپ کو بحرانوں کا انسان کہا ہے۔ آپ بحرانوں کے انسان ہیں۔ مکمل توجہ، بھرپور اور روح کی گہرائیوں تک جھانکنے والی محبت و تمیزت کے بعد صدر بھٹو اور وزیر اعظم چو این لائی نے پیکنگ ایئر پورٹ پر گرمجوشی سے ایک دوسرے کو گلے لگاتے ہوئے الوداع کہا۔ دونوں رہنما اپنے خیالات کے تبادلے سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ چین اور پاکستان کے درمیان نتیجہ خیز شراکت جو ایک بحران میں شروع ہوئی تھی۔ اور جس نے کئی طوفان برداشت کئے۔ ان نشیب و فراز کے باوجود جس کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہوا۔ یہ دوستی اسی انداز سے جاری رہے گی۔

اہم امر یہ تھا کہ دونوں رہنماؤں نے اس بات کو پسند کیا کہ وہ بنیادی اصول اور تفصیلات جن پر دوستی کی عمارت استوار ہوئی تھی، وہ اسی طرح برقرار ہیں۔ وہ ملک جو بڑی بنیاد کو تبدیل کرتا ہے۔ پھر اس کو نتیجتاً دوسری طرف سے ہونے والی تبدیلیوں کی ذمہ داری بھی قبول کرنی چاہیئے ڈپلومیسی اور بین الاقوامی تعلقات میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک ہی وقت میں پسند بھی کیا جائے اور نفرت بھی کی جائے۔ اور سادہ زبان میں ایک مملکت دونوں راستے اختیار نہیں کرسکتی۔ ایک دوست ملک دوسرے دوست ملک سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگرچہ وہ دونوں کی دشمنی ایک ہمسایہ ملک سے مصالحت کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ لیکن صرف دوستی کی خاطر دوسرا دوست ملک ایسا نہ کرے زیادہ ٹھوس الفاظ میں اس رگ مرول کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان اگر مسئلہ کشمیر طے کئے بغیر بھارت سے تعلقات معمول پر لانے کے لئے بھاگ رہا ہے سا ایسے حالات میں پاکستان یقیناً چین کے ایسا کرنے پر کوئی اعتراض کرنے کے لائق نہیں ہوگا۔

ان امکانات کے سلسلے میں ہی جنوری ۱۹۷۲ء میں صدر پاکستان کے دورۂ چین کے دوران عام طور پہ تبادلہ خیال کیا گیا۔ یہی معاملات اور زیادہ ہمہ گیر انداز میں موضوع بحث بنے۔ جب مسٹر بھٹو وزیر اعظم کے طور پر ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۶ء میں پیکنگ گئے۔ ۱۹۷۴ء میں وزیر اعظم چو این لائی اور نائب وزیر اعظم ٹینگ سیاؤ پنگ کے ساتھ مذاکرات میں اس موضوع کی خوب اچھی طرح چھان پھٹک کی گئی۔ چیئرمین ماؤزے تنگ کے ساتھ بھی اس پر کھل کر بات ہوئی تھی۔ چین پاک بھارت تعلقات کی مثلث پر مزید بات چیت ۱۹۷۶ء میں وزیر اعظم ہواکوفنگ کے ساتھ ہوئی۔ اس موقع پر چیئرمین ماؤ سے وزیر اعظم بھٹو کی ملاقات اگرچہ رسمی تھی لیکن وہ ایشیا کے عظیم رہنما چیئرمین ماؤزے تنگ کی وفات سے قبل کسی غیر ملکی رہنما کی آخری ملاقات تھی۔ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۶ء تک اس مثلث کے تمام نکات پر خوب بحث ہوئی۔ اور ان کا تعین کیا گیا۔ کوئی ایسی بات نہیں رہ گئی تھی، جس سے بھارت سے الگ الگ تعلقات پر پاکستان اور چین کے درمیان کسی ممکنہ غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہوتا۔ معاہدۂ شملہ اور اس پر عملدرآمد کے اقدامات انتہائی تفصیل سے بیان کئے گئے۔ مسٹر بھٹو نے چینی لیڈروں سے یہ ضرور کہا کہ چونکہ وہ شملہ گئے تھے، اس لئے انہوں نے بھارتی وزیر اعظم کو پاکستان کا دورہ کرنے کی دعوت بھی دی ہے۔ لیکن اسے کسی طرح بھارتی وزیر اعظم کو چین بلانے کا اشارہ نہیں سمجھا جانا چاہیئے۔ اس انداز رفتار اور لہجے میں چین اور پاکستان کے درمیان محرکات اور ردِ عمل دونوں ملکوں کے باہمی مفاد کو پیش نظر رکھ کر طے کئے گئے۔ اسی مفاہمت کے جذبے کے ساتھ چینی رہنماؤں سے درخواست کی گئی کہ وہ اقوام متحدہ میں بنگلہ دیش کی رکنیت کو اس وقت تک رکوادیں۔ جب تک نوے ہزار پاکستانی جنگی قیدی باعزت طریقے سے پاکستان واپس نہیں کر دیئے جاتے۔ اس لئے یہ کوئی بد اخلاقی کے سبب نہیں تھا کہ وزیر اعظم چین نے بھارتی وزیر اعظم کی طرف سے ان چھ بار مرسلہ پیغاموں کا جواب نہیں دیا۔ جن میں گذارش کی گئی تھی کہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کو بہتر کرنے کے لئے چین اور بھارت کے درمیان بات چیت ہونی چاہیئے۔ ڈپلومیسی میں نہ صرف صحیح پالیسی وضع کرنا ضروری ہوتا ہے، بلکہ اس پر پوری ہم آہنگی اور موزونیت کے ساتھ عملدرآمد بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اس فن میں قابلِ رشک حد تک مہارت حاصل رہی۔

تمام اہم حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے سچی بات یہ ہے کہ بھارت جیسے بڑے سائز اور وسائل والے ملک کے مقابلے میں پاکستان کی سلامتی کے لئے کسی بڑی طاقت کی ضمانت ضروری ہے۔ ۱۹۵۱ء میں بھارتی وزیر اعظم نے پاکستان پر حملے کی دھمکی دی۔ اس وقت کے پاکستان کے وزیر اعظم اور ایک حقیقی سیاسی رہنما نے اس کا جواب مکے کی صورت میں دیا تھا۔ مکے کی شکل میں مزاحمت کے اس جذبے نے پاکستان کے عوام کے حوصلے غیر معمولی طور پہ بلند کر دیئے تھے۔ لیکن صرف یہی کافی نہ تھا۔ پاکستان نے اس ضمانت کے لئے طویل تلاش شروع کی۔ محتاط مذاکرات کے بعد پاکستان اور امریکہ نے ۱۹۵۴ء میں "باہمی دفاعی معاہدے" پر دستخط کئے۔ پاکستان نے آگے بڑھ کر سینٹو اور سیٹو میں شمولیت بھی اختیار کی صدر آئزن ہاور اور جان فاسٹر ڈلس نے واضح الفاظ میں کسی جارحیت کے خلاف پاکستان کی علاقائی سلامتی کے تحفظ کی یقین دہانی کروائی، امریکی فوجی امداد بھی پاکستان پہنچنا شروع ہوگئی۔ رفتہ رفتہ فوجی طاقت کا توازن پاکستان کے حق میں ہوگیا۔ اب نہرو پاکستان کو دھمکی دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اسی لئے اب بھارت کو مکہ دکھانے کی ضرورت بھی پیش نہ آئی۔ ۱۹۶۲ء تک یہی صورتحال رہی۔ جب جان ایف کینیڈی نے امریکہ کی صدارت سنبھالی تو اصل میں تو اس وقت سے ہی غیر نمایاں طور پر امریکہ کے رویے میں تبدیلی آنے لگی تھی۔

پاک چین تعلقات پر کیا کوئی تیسری بڑی بحث ہوئی ہے

عالمی نقشے پر رونما ہوتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ کینیڈی انتظامیہ نے امریکہ کی پالیسیوں کو ان تبدیلیوں کے مطابق کرنے کی کوشش کی۔ اس میں کوئی ذاتی عنصر نہیں تھا۔ تاہم اس بتدریج مطابقت کی رفتار اکتوبر ۱۹۶۲ء کے چین بھارت سرحدی تنازعے کے دوران بڑی تیز ہو گئی۔ امریکہ نے باقاعدہ بھارت کی طرف جست لگائی۔ اس صورتحال نے امریکہ اور پاکستان کے درمیان مزید تناؤ اور تضاد پیدا کر دیئے۔ اس میں فیصلہ کن موڑ ۱۹۶۵ء میں اس وقت آیا جب پاک بھارت جنگ کے دوران امریکہ نے پاکستان کو فوجی سامان کی فراہمی پر پابندی عائد کر دی۔

۱۹۶۵ء کے بعد اور ۱۹۶۵ء کے دوران۔ چین نے امریکہ کی جگہ لے کر پاکستان کے ضرورت کے وقت کے دوست کا کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۷ء تک یہی نوعیت رہی ہے۔ یہ نوعیت اب بھی ممکن ہے وہی ہو لیکن چین بھارت تعلقات میں ہونے والی حالیہ تبدیلیوں پر۔ محکمۂ خارجہ کے ایک ترجمان کا عام سا بیان کام نہیں دے سکتا۔ کیا چین میں پاک چین تعلقات میں شناخت کی مد یا موضوعات پر کوئی تیسری بڑی بحث ہوئی ہے۔ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ لیکن چین یا کوئی بھی بڑی طاقت عالمی تبدیلیوں، علاقے میں ہوتے والے تغیرات اور ملک میں ہونے والی تبدیلیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ پاکستان بڑی عالمی طاقت نہیں ہے۔ لیکن پاکستان ثقافتی انقلاب سے بے خبر نہیں رہا۔ اسی لئے چین کے لئے، یا کسی بڑی طاقت کے لئے یا کسی متعلقہ طاقت کے لئے یہ بھی غیر حقیقت پسندانہ طرز عمل ہوگا کہ وہ پاکستان میں ہوتے والی اہم تبدیلیوں سے بے واسطہ رہیں۔ اگر پاکستان کے حکمران خود زور دے کر یہ کہتے ہیں کہ چھ سال سے بھی کم عرصے میں پاکستان پھر خانہ جنگی کے دہانے پر کھڑا ہے تو دوسری قوتوں کو بھی اس سے اپنے نتائج اخذ کرنے کا حق حاصل ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کئی ملکوں میں فوج نے حکومتوں پر قبضے کئے ہیں لیکن کہیں بھی کسی فوجی حاکم نے اپنے قبضے کا جواز آئین کو چند کاغذات اور جب چاہے اسے پھاڑنے کا کہہ کر نہیں دیا حال ہی میں چین نے اپنے آئین میں بنیادی تبدیلیاں کی ہیں۔ لیکن یہ بڑے باوقار انداز میں کی گئیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چین یا کوئی بھی مہذب یا غیر مہذب ملک آئین کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آئین میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی یا اسے منسوخ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس سے یہ بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ یہ انتہائی خلاف معمول امر ہے کہ قوم کے ایک ایسے بنیادی قانون کے لئے تحقیر کا اظہار کیا جائے، جسے عوام نے خود وضع کیا۔ دوسری قومیں پوچھ سکتی ہیں کہ ایک ملک میں سال میں تین مرتبہ مارشل لاء کے نفاذ کی کیا مصلحت ہے۔

سیاستدانوں پر اس کی ذمہ داری ڈال دینا بہت آسان ہے، لیکن ان کے لئے قائل کرنا مشکل ہے۔ خانہ جنگی کے خطرے کو غیر سیاسی مداخلت سے دور تو نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس میں اور شدت پیدا ہو سکتی ہے۔ تمام ملکوں میں دفاعی افواج۔ حکومت کے تابع ہوتی ہیں وہ سپر گورنمنٹ کے طور پر غالب آنے والی الگ اور خود مختار قوت نہیں ہوتی ہیں۔ اگر کسی غیر معمولی صورت حال میں فوج کے سربراہ کو مداخلت کا فیصلہ کرنا ہے تو اٹلی میں فوجی حکومت ہونی چاہیئے، جہاں اتنے بڑے پیمانے پر اور اتنی شدید قسم کی اغوا کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ یا فرانس میں جہاں چارلس ڈیگال کا آئین ختم ہو گیا تھا، یا وفاقی جمہوریہ جرمنی میں دہشت گردوں کی سرگرمیوں کے باعث یا برطانیہ میں شمالی آئرلینڈ، نارکین وطن کے سبب یا کینیڈا میں کوئلے کی ہڑتال کے باعث دنیا میں کوئی بھی ایسا علاقہ نہیں ہے جو کشیدگی سے آزاد ہو۔ ہر ملک میں کوئی نہ کوئی مسئلہ ایسا ہے جو اب پہلے سے زیادہ سنگین ہے ذمہ دار قومیں ایسے مسائل کا بغور گہرا مطالعہ کرتی ہیں

چین میں تیسری بحث ہوئی ہے یا نہیں تاہم پاکستان بھارت اور چین کے درمیان ہونے والی حالیہ تبدیلیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا یہ تبدیلیاں محض قیاس آرائی نہیں ہیں۔ اور نہ ان کے وجود سے انکار کیا جا سکتا ہے جولائی ۱۹۷۷ء سے اب تک کافی بنیادی تبدیلیاں ہوئی ہیں پاکستان کے عوام نے بھی نومبر ۱۹۷۷ء سے مارچ ۱۹۷۸ء تک برصغیر میں اور اپنے علاقے میں سفارتی سرگرمیوں کا ایک تیز سلسلہ دیکھا ہے۔ بادشاہ صدر، وزرائے اعظم، اور وزرائے خارجہ آئے گئے۔ بہت سے واقعات ابھی بطن میں ہیں۔ اب تک رونما ہونے والے تمام اہم واقعات میں سے پاکستان کے لئے دیرپا بنیادوں پر اہم ترین واقعہ چین اور بھارت کے درمیان حالیہ مثبت تبدیلی ہے۔

۱۶ سال کے طویل وقفے کے بعد فروری ۱۹۷۸ء میں چین کے ایک اعلیٰ سطحی وفد نے بھارت سے اقتصادی اور تجارتی رابطے استوار کرنے کے لئے بھارت کا دورہ کیا۔ اسی مہینے میں نائب وزیر اعظم ٹینگ سیاؤ پینگ بھی رنگون اور کھٹمنڈو گئے۔ رنگون میں چینی نائب وزیر اعظم نے بھارت سے تعلقات بہتر کرنے کے لئے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ کھٹمنڈو میں بھی انہوں نے ایسا کیا۔ ہر ملک کی اپنی سفارتی روایات اور سفارتی انداز ہوتے ہیں۔ چینی سفارت کاری کی روایات اتنی ہی قدیم ہیں جتنی ان کی تہذیب۔ امور خارجہ میں چینی طریق کار کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ چینی علامیت، کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک برما اور نیپال کی سرزمین پر چین بھارت تعلقات کے ضمن میں نائب وزیر اعظم ٹینگ سیاؤ پینگ کے یہ اعلانات عام چینی طرز سے ہٹ کر ہیں۔ چین۔ پاک۔ بھارت تعلقات کی تثلیث کے گذشتہ سولہ سال کا انداز ذہن میں رکھتے ہوئے یہ تبدیلی ایک واضح تبدیلی ہے۔ اگلے مہینے مارچ ۱۹۷۸ء میں چینی خیرسگالی وفد نے وانگ پنگ نما کی قیادت میں پاکستان کا دورہ کیا اسی وفد کو بھارت کا دورہ بھی کرنا تھا۔ یہ بات کہ چین کے خیرسگالی وفد کا پاکستان اور بھارت کا بیک وقت دورہ کرنا بھی معنی خیز نہیں ہے چین سے خیرسگالی کے مشن میں پاکستان اور بھارت کو بریکٹ کرنا اس بات کی غمازی ہے کہ چین سمجھتا ہے کہ پاکستان اور بھارت کے تعلقات بالکل

باقی صفحہ ۵۰ پر

کوریائی عوام کے عظیم رہنما

صدر کم اِل سنگ

کی چھیاسٹھویں سالگرہ

مسٹر کم ہیونگ جک قید خانے میں ایک تو دواؤں کا مطالعہ کرتے رہے دوسرے رہائی کے بعد از سر نو جدوجہد شروع کرنے کے منصوبے تیار کرتے رہے۔ انہوں نے ایک ہسپتال تعمیر کرنے کو سوچا جو کامریڈوں اور تنظیم کے لوگوں سے ملاقات کے ایک بہترین مرکز کا کام دے گا۔ یہ ایک ایسی جگہ ہوگی۔ جہاں سے وہ جاپانی سامراج کی نگرانی کے باوجود قانونی طور پر جنگ کر سکیں گے۔

۱۹۱۸ء کے موسم بہار میں انہیں قید سے رہائی مل گئی اس وقت اُن کا سارا جسم ضربات اور زخموں سے چور تھا یہ ساری ضربیں اور چوٹیں ایذا رسانی کی علامات تھیں گھر پر کچھ دنوں آرام کرنے کے بعد ان کی صحت ایک حد تک سدھر گئی۔ انہوں نے اندازہ کر لیا کہ اپنے گاؤں میں رہ کر انقلابی سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ یہاں دشمن کی کڑی نظریں ہر وقت ان پر لگی رہتی ہیں۔ اس لئے وہ دریائے ارموک کے کنارے ایک سرحدی مقام پر چلے گئے تاکہ دل میں وطن عزیز کی خدمت کرنے کا جو جذبہ موجزن تھا اسے تسکین دے سکیں۔ اپنے گاؤں سے رخصت ہوتے سے پہلے انہوں نے ایک نظم لکھی جس میں وطن کے لئے جنگ کے ناقابل شکست عزم اور بالآخر اپنی فتح پر اعتماد کا اظہار تھا۔ نظم یہ تھی۔

ساتھیو۔ تمہیں معلوم ہے۔

نامسن کی پہاڑی پر جو سبز صنوبر کا درخت ہے

وہ ہمہ اقسام کی مصیبتیں اور صعوبتیں جھیلنے کے بعد جو برفباری اور ژالہ باری کے سبب آتی ہیں۔ پھر زندگی زندگی حاصل کرے گا۔ جب دوبارہ بہار آئے گی۔

اور سورج کی شعاعیں روشن ہوں گی۔ ان کے گھر والوں کو ان کی صحت سے متعلق تشویش تھی۔ لہٰذا انہوں نے کہا کہ مکمل صحت ہونے تک گھر پر ہی رہیں۔ لیکن انہوں نے یہ کہتے ہوئے گھر چھوڑ دیا کہ "۔ اگر ہمارا وطن عزیز آزادی حاصل نہیں کرتا تو یہ زندگی بھی جینے کے قابل نہیں رہتی ہے مجھے لازمی طور پر جاپانی حملہ آوروں سے لڑنا اور فتح حاصل کرنا ہے چاہے اس کی خاطر میرے گوشت کے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں اور میری ہڈیاں پیس کر سرمہ بنا دی جائیں۔ اگر میں اس جنگ میں کامیاب نہیں ہوتا تو میرا بیٹا اسے جاری رکھے گا اور اگر میرا بیٹا بھی اسے نامکمل چھوڑ جاتا ہے تو میرا پوتا بھی یقیناً اسے جاری رکھے گا۔ کیونکہ ہمیں کوریائی جنگ آزادی بہر حال جیتنا ہے۔

مسٹر کم ہیونگ جک نے پہلے پہل جونگانگجین میں جدوجہد شروع کی۔ لیکن بعد میں وہ اپنے آبائی وطن لوٹ آئے۔ یہاں سے اپنی اہلیہ، بڑے بچے (جنرل) اور چھوٹے بچے کو لے کر جونگانگجین کے راستے دریائے آمروک عبور کر کے جنوبی پینگوریا کے تونگو صوبے میں داخل ہو گئے جہاں اُس خاندان نے لن جیانگ کے مقام پر اپنا گھر بنا لیا پھر ٹپاؤ کو، چونگیائی کاؤنٹی اور فوسونگ گئے اس طرح مختلف مقامات میں پھرتے رہنے کے باعث وہ جاپانی حکام کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اور ان کے ہاتھوں بلیک میل ہونے سے بچے رہے۔ ان علاقوں میں جو کوریا اور منچوریا کی سرحد سے قریب تھے اپنے بہت سے ہم وطن رہتے تھے۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں سے اپنے وطن کے کامریڈوں سے بہ آسانی رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا۔ ایسی ہی باتوں پر غور کرنے کے بعد مسٹر کم ہیونگ جک نے اپنی جدوجہد کے لئے اس سرحدی علاقے کا انتخاب کیا۔

بظاہر وہ علاج معالجہ کرتے تھے اور ان اضلاع کے مریضوں کو دوا دارو دیا کرتے تھے لیکن اسی کے ساتھ ایسے لوگوں سے بھی ملا کرتے تھے۔ جن کا تعلق تحریک آزادی سے تھا۔ وہ یہاں سے وطن کی خاطر جنگ کرنے کے لئے آدمی بھیجا کرتے تھے۔ وہ غریب مریضوں کا مفت علاج کرتے اور آزادی کی جدوجہد میں وطن اور بیرونی ممالک کے درمیان رابطہ کا کام کرتے۔

ملک کے اندر کامریڈوں سے رابطہ دواؤں کی ڈاک کے ذریعے قائم رہتا۔ ملک کے مختلف علاقوں خصوصاً پیونگیانگ، سیئول، پوسان وغیرہ میں دواؤں کے جو پیکج بھیجے جاتے تو ان میں سے صرف دوائیں ہی نہیں ہوتیں بلکہ ان کے اندر اہم پیغامات اور دیگر مواد بھی ہوتے جو وہ ملک کی مختلف تنظیموں کو بھیجا کرتے۔

لیا اوقات مریضوں کے معائنہ کے بہانے وہ اکثر دوروں پر بھی نکل جاتے اور نہ صرف فوسونگ کاؤنٹی بلکہ اپنے وطن کا بھی دورہ کرتے۔ ایسے دورے پر دس بیس دن تک صرف ہو جاتے۔ لیکن ۱۹۲۴ء کے موسم سرما کے اواخر میں انہیں ایک مرتبہ پھر گرفتار کر لیا گیا۔ جاپانی سامراج کی پولیس نے انہیں اس وقت پیونگ میں گرفتار کیا جب وہ اپنی سرگرمیوں کے سلسلے میں کوریا گئے ہوئے تھے۔ گرفتار کرنے کے بعد اس خدشے کی بنا پر کہ کہیں حریت پسند فوج انہیں چھڑا نہ لے۔ جاپانی پولیس نے انہیں ایک پولیس مین کی معیت میں انہیں براہ راست

ہوچنگ جک تھانہ بھیج دیا۔ اس پولیس مین کا نام اکیشیما تھا۔ مسٹر کم ہیونگ جک کو قطعی کوئی پریشانی یا مایوسی نہیں تھی۔ کامریڈ ہوانگ نے جب ان کی گرفتاری کی خبر سنی اور یہ معلوم ہوا کہ ایک پولیس مین کی معیت میں انہیں لے جایا جارہا ہے تو انہوں نے فوراً ایک بوتل شراب لے کر ان کا پیچھا کیا۔ کامریڈ ہوانگ نے قریب جاکر اکیشیما کو ایک بار میں چل کر شراب پینے کی دعوت دی۔ وہ راضی ہوگیا۔ چنانچہ کامریڈ ہوانگ نے اسے پلا کر بدمست کردیا اور اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسٹر کم ہیونگ جک فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے بعد وہ بہت دنوں تک ایک پہاڑی جھونپڑی کے اندر چھپے رہے ایک بوڑھا آدمی جس کا نام کم تھا ان کی دیکھ بھال کیا کرتا۔ یہاں بڑی سخت سردی پڑتی تھی۔ جس کے سبب وہ بیمار پڑ گئے۔ آخر وہاں سے پاٹاؤ کے راستے فلوسنگ چلے گئے۔ لیکن یہاں بھی بیماری نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ تاہم جاپان کے خلاف جنگ کرنے والے اس سورما سپاہی کم ہیونگ جک تحریک سے کنارہ کش نہیں ہوتے بلکہ پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ تحریک میں شریک رہے۔

مسٹر کم ہیونگ جک کی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیت انہیں آرام کرنے کا قطعی موقعہ نہ دیتی جس کا اثر اُن کی صحت پر پڑا جو روز بروز بگڑتی ہی چلی گئی۔ بالآخر کوریا کا یہ عظیم محب وطن اور استاد جس نے اپنی زندگی وطن کی خاطر جدوجہد کے لئے وقف کر رکھی تھی ۵ رجون ۱۹۲۶ء کو محض ۳۲ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوگیا اور وطن سے متعلق اپنی نامکمل آرزوؤں اور توقعات کی تکمیل کی ذمہ داری اپنی اہلیہ اور تین بچوں کے کاندھوں پر چھوڑ گیا۔

جنرل کی بیوہ ماں مسز کانگ بن سوک نے اپنے شوہر کے نقشِ قدم پہ چلتے ہوئے اپنی زندگی قربانیوں کے لئے وقف کردی۔ اب بچوں کی پرورش کی ذمہ داری بھی انہیں کے کاندھوں پر تھی۔

مسز کانگ بن سوک ۲۱ راپریل ۱۸۹۲ء کو جنوبی صوبہ پیونگن کی ڈائیڈونگ کاؤنٹی کے مقام چل گول میں پیدا ہوئی تھیں وہ مسٹر کانگ ڈون ووک کی دوسری صاحبزادی تھیں۔ مسٹر کانگ ڈون ووک بھی ایک مخلص محبّ وطن اور تجربہ کار معلم تھے جنہوں نے اپنی زندگی کے تیس سال ابھرتی ہوئی نسل کو تعلیم دینے پر صرف کئے چنانچہ ان کے شاگردوں نے ان کی یاد اور ان کے کارناموں کو لافانی بنانے کے لئے ان کی ایک یادگار ربیوک گاؤں میں قائم کی (یہ گاؤں اب چیل گولڈونگ کہلاتا ہے اور ضلع منگیونگڈائی صوبہ پیونگیانگ میں واقع ہے)

مسز کانگ بن سوک کے بڑے بھائی مسٹر کانگ جن سوک بھی وطن کے ایک بے لوث سپاہی تھے جنہوں نے وطن کی آزادی کی خاطر جاپانیوں کے خلاف طویل جنگ میں حصّہ لیا۔ انہوں نے نوعمری ہی میں وطن کی آزادی کی خاطر جاپانیوں کے خلاف ہتھیار اُٹھالیا تھا اور طویل عرصے تک وطن کے اندر اور باہر لڑتے رہے انہوں نے جاپان دشمن محبان وطن کی طاقت کو مجتمع کرکے "کورین انڈی پنڈنٹ یوتھ لیگ" قائم کی اور اس کے لیڈر کی حیثیت سے جنگ کرتے رہے۔ یکم مارچ کو تحریک کے دوران انہوں نے اپنے والد کے ساتھ مل کر مانگیونگڈائی اور آس پاس کے علاقوں میں مظاہروں کا اہتمام کیا۔ اور ان کی رہنمائی کی۔ بعد میں وہ شمالی چین کے علاقے میں چلے گئے اور وہیں کوریا کی آزادی کی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ وقفے وقفے سے کوریا کے مختلف علاقوں کے بھی دورے کرتے۔ آخر پولیس نے انہیں پیونگیانگ کے ڈائیڈونگ ہوٹل سے گرفتار کرکے پندرہ سال کے لئے جیل بھیج دیا۔ جیل میں ۱۳ سال ۲ ماہ گذارنے کے بعد شدید علالت کے باعث انہیں پیرول پہ رہا کیا گیا لیکن وہ بیماری سے جانبر نہ ہوسکے۔ آخر کار جیل واپس جانے کے بجائے اس دنیا سے ہی رخصت ہوگئے۔

ایک ایسے انقلابی خاندان میں پرورش پانے کے باعث مسز کانگ بن سوک کا ذہن بھی انقلابی تھا۔ انہیں بچپن ہی سے جاپانی سامراجیوں سے سخت نفرت ہوگئی تھی۔ وہ ایک ممتاز کردار و صلاحیت کی مالک خاتون تھیں۔ خاندان انقلابی تھا اس لئے غریب بھی تھا۔ لہٰذا مفلسی کے باعث انہیں حصول تعلیم کے لئے کسی اسکول میں جانے کا موقع نہ مل سکا۔ انہوں نے گھر پہ اپنے والد ہی سے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھا۔ خاص طور پر انہوں نے کوریائی زبان کے حروف سیکھ لئے جن کی اس زمانے میں کوئی قدر نہیں تھی۔ لکھنے پڑھنے کے علاوہ وہ کھیتی باڑی کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتیں اور گھر کا کام بھی کرتیں۔ رات گئے تک گرگھہ چلاتیں اور اس کے ساتھ لکھنا پڑھنا بھی کرتیں۔

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں استحصالیوں کے خلاف نفرت بھی بڑھتی گئی اور انہوں نے گاؤں کی عورتوں کو یہ بتانا اور سمجھانا شروع کیا کہ زمیندار کسانوں کا استحصال کرتے ہیں۔

ایک دن اوائل موسم گرما میں جبکہ ان کی عمر پندرہ سال تھی کھلیان سے واپس آرہی تھیں کہ ایک گھر کے دروازے پہ ایک عورت کو دیکھا جو اپنے بچے کو پشت پہ لادے سوت کاتنے میں مصروف تھی بچہ بے تحاشا رو رہا تھا۔ اس عورت کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ عورت بچے کو بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن خود اس کی آنکھیں نم آلود تھیں۔

مسز کانگ بن سوک نے بچے کو عورت کی پیٹھ سے اٹھا کر اپنی پیٹھ پہ لاد لیا اور سوت کاتنے میں اس عورت کی مدد کرنے لگیں۔ لیکن بچہ روتا ہی رہا بلکہ زیادہ زور و شور سے رونے اور مسز سوک کی پشت پہ لاتیں چلانے لگا۔ بچہ دراصل چاول کے ایک مزیدار کیک کے لئے رو رہا تھا جو اس کے سامنے ایک دوسرے خوشحال گھرانے کا بچہ کھا رہا تھا۔

وہ عورت کچھ دیر تو خاموشی سے سوت کاتتی رہی پھر غصے میں آکر اس نے بچے کو پیٹنے کی کوشش کی۔ مسز کانگ بن سوک نے بچے کو پیٹنے سے بچاتے ہوئے اس عورت سے کہا۔ "تم اس بھوکے بچے کو کیونکر قصوروار ٹھہرا سکتی ہو جبکہ قصوروار کوئی اور ہے۔۔۔ اس پیارے معصوم بچے کو پیٹنے کا کیا فائدہ؟ ہمیں تو ان بدمعاشوں سے لڑنا ہے جو ہم سے ہمارا سب کچھ چھین لیتے ہیں اور ہمیں اس قابل بھی نہیں چھوڑتے کہ اپنے بچوں کو ایک ٹکڑا چاول کا کیک ہی دے سکیں۔ تم تو جانتی ہی ہوگی کہ زمیندار ہمارے چاول، ہمارے خون پسینے کی کمائی

ہم سے چھین کر لے جاتے ہیں۔ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم؟ انہیں ظالموں کی وجہ سے ہم افلاس کے شکار ہیں۔ یہی ہماری ساری بدبختی، بھوک اور فاقہ کشی کے ذمہ دار ہیں۔ تمہارے دل کا درد ہم سبھوں کے دل کا درد ہے۔"

ان کی یہ باتیں سن کر اس عورت نے اپنے بچے کو سینے سے لگالیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹ بھینچ کر اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی جو تضادات سے بھری اس دنیا کے خلاف اس کے دل میں موجزن تھے۔

اس شائستہ اور اعلیٰ اوصاف کی حامل خاتون۔ مسز کانگ بن سوک کی شادی ۱۹۰۸ء میں مسٹر کم ہیونگ جک سے ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۷ سال تھی۔ وہ بارہ افراد پر مشتمل تھی جس خاندان کی بڑی بہو بن کر آئیں وہ بھی کوئی خوشحال گھرانا نہیں تھا۔ وہ نہایت ہی حسن اخلاق کے ساتھ اپنے ساس سسر کی خدمت کرنے لگیں۔ نندوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتیں اور گھر کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا کر اس حسن و خوبی سے سارا کام انجام دینے لگیں کہ گھر ہی نہیں گاؤں کے لوگ بھی ان کے مداح ہو گئے۔

۱۹۱۷ء کے موسم گرما کے تہوار کے موقع پر کانگڈونگ کاؤنٹی میں جب ان کے شوہر نے انقلابی سرگرمیاں شروع کیں تو یہ بھی اپنے شوہر کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ اس موقع پر ایک پڑوسی کے گھر سے ان کے ہاں ایک پلیٹ چاول کے کیک آئے۔ گرچہ ان دنوں ان کے گھر کی یہ کیفیت تھی کہ مشکل ہی سے دلیا میسر آتی تھی تاہم انہوں نے وہ کیک خود نہیں کھائے بلکہ بحفاظت تمام اسے اپنی ساس کے لئے رکھ دیا جو مانگیونگڈائی سے جلد ہی ان کے ہاں آنے والی تھیں۔ لیکن ان کی ساس کے آنے میں کئی دنوں کی تاخیر ہوگئی۔ تاہم انہوں نے وہ کیک نہیں کھائے، بلکہ انہیں کے لئے رکھ چھوڑے اور صبح شام الٹ پلٹ کر دیکھ بھال کرتی رہیں تاکہ خراب نہ ہونے پائیں۔

ان کی ساس کے آنے میں دس دن کی تاخیر ہوگئی آخر کار جب وہ آئیں تو ان کے سامنے وہی کیک رکھ دیئے اور وہ یہ کیک کھاتی جاتی تھیں اور اپنی بہو کے خلوص و محبت کی داد دیتی جاتی تھیں۔ انہوں نے کہا "واقعی میں تمہارے خلوص سے بے حد متاثر ہوئی ہیں۔ ایک پرانی کہانی ہے کہ ایک شخص نے موسم سرما میں برف کی تہوں کو کھود کر بڑی گہرائی کے اندر سے بیریاں نکالی

خاندان افلاس و نکبت کا شکار تھا۔ ایسی حالت میں مہمان نوازی آسانی کام نہیں لیکن ان کے گھر مہمانوں کی آمد کا تانتا بندھا رہتا۔ زیادہ تر مہمان وہ انقلابی کارکن ہوتے جو اپنی سرگرمیوں کے سلسلے میں ان کے ہاں آکر پناہ لیتے۔ ایسے مہمانوں کی آمد کے لئے کوئی خاص وقت نہ ہوتا۔ اکثر مہمان آدھی رات کو بھی آجاتے مسز کانگ بن سوک کا برتاؤ ہر مہمان کے ساتھ خواہ وہ کسی وقت بھی آئے انتہائی مشفقانہ اور محبت آمیز ہوتا ہے ایسا وقت بھی ہوتا جب کہ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہ ہوتا اور کوئی مہمان چلا آتا۔ لیکن ایسے وقت بھی ان کی پیشانی شکن آلود نہ ہوتی۔ وہ مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان کرنے کے علاوہ ان کے کپڑے تک دھویا کرتیں۔ ساری زندگی ان کا یہی معمول رہا۔ انتہائی ناموافق حالات میں بھی ان کا یہ عزم کبھی متزلزل نہ ہوسکا کہ مادر وطن کو اغیار کا چنگل سے آزاد کرانا ہے۔ وہ وطن کی آزادی کا مستحکم یقین رکھتی تھیں۔ وہ جہاں رہیں۔ اور جن لوگوں سے بھی ان کا واسطہ پڑا۔ سب نے ان کی تعریف ہی کی کبھی کسی نے ان کی مذمت نہیں کی۔

ایک دفعہ جنرل، فوانگ میں نوجوانوں کی ایک تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔ انہیں اس مہم کے لئے ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ ہتھیار ایک دور کے علاقے میں ساتھیوں کے پاس تھے وہاں جاکر ہتھیاروں کا لانا آسان نہیں تھا۔ مسز کانگ بن سوک کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے راستے کے خطرات کی پرواہ کئے بغیر وہاں چلی گئیں۔ اور مطلوبہ ہتھیار لاکر جنرل اور ان کے ساتھیوں کے حوالے کر دیا۔

وہ انقلابیوں کی مشفق و مہربان ماں تھیں۔ ان کی سرپرستی کرتیں۔ مدد کرتیں۔ اور جب ضرورت پڑتی تو ایک بہادر کی حیثیت سے خود بھی میدان عمل میں کود پڑتیں۔ مسٹر کم ہیونگ جک کے مرنے کے بعد انہوں نے انقلابی خواتین کی ایسوسی ایشن میں شرکت کرلی تھی ۱۹۲۸ء میں وہ پیشان ڈسٹرکٹ ومن ایسوسی ایشن کی چیئرمین منتخب ہوئیں۔ اب ان کا دائرۂ کار کافی وسیع ہوگیا دن کے وقت انقلابی سرگرمیوں میں مصروف نہیں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کا دورہ کرتیں اور رات کے وقت درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھتیں جنرل کی قیادت میں ایک خفیہ مرکز کام کر رہا تھا۔ مادام نے اس میں شرکت کی اور اس مرکز کے لئے زبردست معاون ثابت ہوئیں۔

وہ اسی طرح ایک محب وطن بہادر اور بے لوث کارکن کی حیثیت سے مادر وطن کی آزادی میں شرکت کرتی رہیں یہاں تک کہ ۳۱ جولائی ۱۹۳۲ء میں ایک طویل علالت کے بعد چالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئیں موت سے تھوڑی دیر پہلے انہوں نے اپنی ایک پڑوسن سے جو اس وقت ان کے بستر کے قریب موجود تھیں کہا۔ "...... اگر میرا بیٹا اس طور پر واپس آئے جیسا کہ میں چاہتی ہوں۔ یعنی کوریا آزاد ہوچکا تھا۔ تو اس سے ویسا ہی سلوک کرنا جیسا کہ میں کرتی لیکن اگر وہ اس طرح آئے کہ دشمن ہماری سرزمین پر موجود ہو اور غلامی کا جوا ہماری گردن پر ہو تو اس سے کہہ دینا کہ میری قبر پر بھی اس کے جانے کی ضرورت نہیں"

ان کے یہ الفاظ ان کے مرنے کے بعد عرصہ تک سارے ملک میں سنے جاتے رہے اور ان الفاظ سے کوریا کی آزادی کے لئے ایک نیا ولولہ اور نیا جوش پیدا کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ ہر بڑے آدمی کی پشت پر بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ خاص کر اس کے والدین بڑے دل والے ہوتے ہیں۔ جنرل کے معاملے میں یہ بات سو فی صد درست ہے یہ جنرل کے والدین ہی کا فیض تھا۔ کہ وہ اس قدر جلد کوریا کی تاریخ میں ہیرو بن گئے۔

∞

کم ال سنگ کی والدہ بھی وطن کی آزادی کا یقین رکھتی تھیں

ابنِ انشا کی یاد میں

اشاعتِ خصوصی
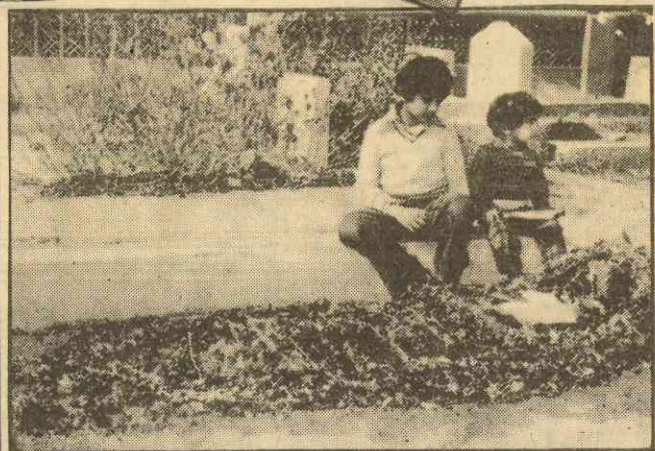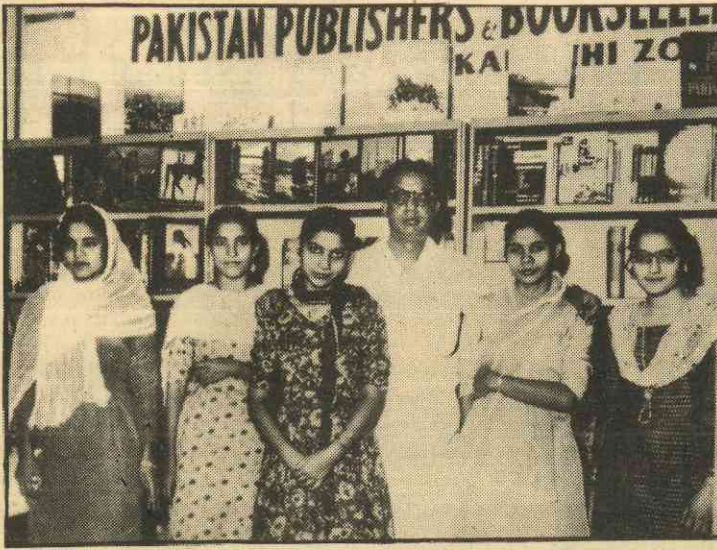
بھائی جان نے کبھی بھی اپنے اور میرے بچوں میں فرق نہ جانا

وہ اپنی ذات سے کسی کو پریشان کرنا پسند نہ کرتے تھے

نادرہ خاتون

کل شام میرا بھتیجا محمود خاور میرے پاس آیا باجی۔ معیار کا بھائی جان نمبر آرہا ہے۔ اچھا پھر میں نے سوالیہ نظریں اُس کی طرف اٹھادیں۔

بس آپ بھی ہمت کر کے بھائی جان کے بارے میں کچھ لکھ دیں۔ زیادہ نہیں تو ایک ڈیڑھ صفحہ کچھ یادیں۔ کچھ باتیں۔ میں نے معیار والوں سے وعدہ کرلیا ہے کہ آپ ضرور کچھ نہ کچھ لکھ کر دیں گی۔

نہیں خاور بیٹے۔ بھائی جان کے لئے لکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ تم ایک ڈیڑھ صفحے کی بات کر رہے ہو۔ ان کی یادیں ان کی باتیں تو اتنی ہیں کہ میں ساری عمر بھی لکھتی رہوں تو ختم نہ ہوں لیکن مجھ میں تو ایک لفظ لکھنے کی تاب نہیں سبھی لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ ساری دنیا انشاء بھائی جان پر مضمون لکھ چکی ہے ملک کے گوشے گوشے سے ان کی یادوں کو اُن کی محبتوں کو ان کے چاہنے والوں نے ان کے مداحوں نے اخباروں اور رسالوں میں لکھ لکھ کر انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے تم کیسی بہن ہو کہ بھائی کو بچھڑے دو ماہ ہونے کو آئے اور تمہارے قلم سے ان کے لئے ایک لفظ نہیں نکلا ہاں اے لوگو۔ میں ایسی ہی بہن ہوں۔ جو ان کی رتی رتی یاد کو دل میں لئے ویران ویران نظروں سے ان کی ہر چیز کو تکتی رہتی ہوں۔ ہر چیز جوں کی توں رکھی ہے بالکل اسی طرح جس طرح وہ سال بھر پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔ ان کی زندگی کا سرمایہ کتابیں۔ شوکیسوں میں سجی ہوئی کتابیں۔ الماریوں میں بند کتابیں۔ پیٹیوں میں پیک کر کے رکھی ہوئی کتابیں۔ گھر میں چاروں طرف ہی کتابیں۔ اور میں نے گیارہ ماہ ان سب کتابوں کی گرد جھاڑتے انتظار ہی انتظار میں گذار دیئے۔ تاکہ جب بھائی جان لندن سے واپس آئیں تو دیکھ کر خوش ہوں کہ میری بہن نے ان کے سرمایہ حیات کی کس طرح حفاظت کی ہے لیکن یہ کیا بھائی جان آپ آئے تو کس طرح —

ایک خوبصورت قیمتی کتاب کی طرح شوکیس میں سج کر۔ اور میں بدنصیب شیشے کے اوپر سے آنکھیں پھاڑے سینہ پیٹتی روتی چلاتی آپ کو چھونے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن یہ کیسا شوکیس بنوایا تھا آپ نے جس کا نہ کوئی پٹ تھا نہ تالا۔ میں ایک بار آپ کو چھونا چاہتی تھی۔ آپ کے نرم نرم ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہتی تھی۔ میں ایک بار اُن ہاتھوں کا لمس اپنے ہاتھوں پر پھر محسوس کرنا چاہتی تھی۔ وہی لمس جو میرے رگ و پے میں چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ہر وقت محسوس ہوتا ہے اس وقت سے جب میں نے ہوش سنبھالا تو ننھا سا بستہ گلے میں لٹکائے بھائی جان کی انگلی پکڑے محسوس کیا تھا اور پھر میں یہ کیسے بھول سکتی ہوں کہ انہی ہاتھوں سے مجھے بڑی محبت سے کندھوں سے تھامے انہوں نے مجھے ڈولی میں سوار کر دیا تھا اور اس وقت میں نے اُن کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ سی محسوس کی تھی گھونگھٹ کے اندر سے میں نے گھبرا کر بھائی جان کی طرف دیکھا اور موٹے موٹے آنسو اُن کے رخساروں پر شبنم کی طرح چمک رہے تھے اور وہ اپنے موٹے شیشوں کا چشمہ اتار کر سفید رومال سے صاف کر رہے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اس وقت بھائی جان کو آنسوؤں سے روتے دیکھا تھا اور میرے دل میں اس وقت ایسی ہوک سی اٹھی تھی کہ جی چاہتا تھا ساری رسموں کو بھول کر بھائی جان کے سینے سے چمٹ جاؤں ایک ایک بات یاد کر کے دل میں دکھ کی لہریں سی اٹھتی رہتی ہیں۔

شادی کے بعد بھی میرا اور بھائی جان کا نو برس تک چوبیس گھنٹوں کا ساتھ رہا تھا۔ بھائی جان کی شادی

کے تیسرے دن میرے شوہر کا ٹرانسفر لاہور سے کراچی کا ہو گیا تھا۔ کراچی میں ہمارا ارادہ الگ گھر لیکر رہنے کا تھا لیکن بھائی جان نے ہماری ایک نہ سنی اور کہا۔ نہیں تم لوگ میرے ساتھ ہی رہو گے اور اس طرح میں اپنے ننھے بچوں اور شوہر کے ساتھ بھائی جان کے ساتھ ہی رہنے لگی۔ ہمارے گھرانے میں بھائی جان کا احترام گھر کے بڑے بزرگ کی حیثیت سے کیا جاتا تھا اور بھائی جان بھی بھائی بہنوں اور سب کی اولادوں پر جان چھڑکتے تھے۔

میرے بچے سب کے بچوں میں سے اس لئے خوش قسمت رہے کہ پاس رہنے کے باعث ماموں کی محبت کا سب سے زیادہ فیض حاصل کرتے تھے۔ بھائی جان نے کبھی بھی اپنے اور میرے بچوں میں فرق نہ جانا۔ ملکوں ملکوں سیر کو جاتے اور واپسی میں بڑوں سے لیکر چھوٹوں تک کے لئے چھوٹے موٹے تحفوں کے انبار ساتھ لے کر آتے اور خوشی خوشی سب میں تقسیم کرتے۔ بھائی جان کو غصہ کبھی نہیں آتا تھا۔ اس کے باوجود ان کا سب پر رعب تھا۔ گھر میں کوئی بھی بات ہو۔ پہلے بھائی جان سے پوچھا جاتا تھا۔ دفتر کے بعد اُن کو اِدھر اُدھر دوستوں وغیرہ میں وقت گذارنے کی بالکل عادت نہ تھی۔ سرِ شام گھر آ جاتے تھے اور دوسروں کو بھی مثلاً ریاض بھائی جان ہاشم صاحب (میرے شوہر) اور بابر خاور کو ہمیشہ شام سے پہلے گھر آنے کی تلقین کرتے تھے۔ کسی پارٹی یا جلسے میں بغیر گھر اطلاع دیئے شریک نہ ہوتے تھے۔ گھر سے جاتے تو بتا کر جاتے کہ میں اتنے بجے تک واپس آ جاؤں گا اگر کسی صورت دیر ہونے کے امکان ہوتے تو فون کر کے گھر میں اطلاع ضرور دیتے اگر کسی جگہ فون کرنے کا ذریعہ نہ ہوتا تو پارٹی مشاعرہ یا جو بھی فنکشن ہوتا ادھورا چھوڑ کر گھر آ جاتے تاکہ دیر نہ ہو جائے اور گھر والے انتظار کرتے کرتے پریشان نہ ہو جائیں۔

گھر میں وہ اپنی ذات سے کسی کو پریشان کرنا کبھی پسند نہ کرتے تھے اور اپنی اس بات کو انہوں نے آخری وقت تک نبھایا۔ اپنی منحوس بیماری کا علم انہیں خود ہی ہو گیا تھا اور وہ پہلا آپریشن گلے کا کراچی شفا ہسپتال میں کرانے پر آمادہ بھی ہو چکے تھے گلے کے ایک طرف کافی ابھار سا نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اور بھابھی جان نے کئی بار فکر مند ہو کر اُن سے پوچھا تھا کہ یہ کیسا اُبھار ہے ڈاکٹر کیا کہتے ہیں کوئی تشویش ناک بات تو نہیں لیکن انہوں نے معمولی گلینڈ میں چھوٹا سا آپریشن ہوگا کہہ کر ٹال دیا آپریشن ہوا اور کامیاب رہا کچھ ماہ بعد ناشتے کی میز پر ناشتہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "بھئی میں چھ ماہ کے لئے لندن جا رہا ہوں ہو سکتا ہے ایک سال رُک جاؤں"۔

میرا دل نہ جانے کیوں اس وقت دھک سے رہ گیا۔ میں نے اپنے برابر کی کرسی پر بیٹھی بھابھی جان کی طرف دیکھا وہ خاموشی سے ناشتہ کر رہی تھیں۔ مجھے احساس ہو گیا کہ یہ بات بھابھی جان کو پہلے سے معلوم ہے اور بھائی جان اس وقت صرف مجھے بتانا چاہتے ہیں۔

آپ اکیلے جائیں گے یا بھابھی جان اور بچوں کو

> **انہوں نے اپنے**
> **آپریشن کی خبر میں**
> **کسی کو اطلاع**
> **نہیں دی تھی**

ساتھ لے کر میں نے بڑی مشکل سے اپنی گھٹی گھٹی آواز پر قابو پاتے ہوئے پوچھا "فی الحال تو اکیلا جاؤں گا۔ بعد میں ان لوگوں کو مکان وغیرہ کا بندوبست کر کے بلا لوں گا۔ وہ میرے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھ کر جان چکے تھے کہ مجھے اس خبر سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ خود ہی بولے ملک سے باہر تم سب سے الگ رہنا میں نے کبھی پسند نہیں کیا سال بھر کی تو بات ہے اتنی بڑی پوسٹ ہے اور پھر میں چاہتا ہوں وہاں جا کر اپنا مکمل چیک اپ بھی کراتا رہوں۔

یہ تو ٹھیک ہے بھائی جان میں ایک سال تک اتنے بڑے گھر میں اکیلی کیسے رہوں گی۔ مجھے تو بالکل عادت نہیں"۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو اندر ہی اندر پی جانے کی کوششیں کرتے ہوئے کہا "بھئی میں چکر لگاتا رہوں گا میرے لئے آنا کونسا مشکل ہے اور پھر ہو سکتا ہے کچھ عرصے بعد تمہیں اور ہاشم کو اپنے پاس بلا لوں"۔ میرا دل جانتا تھا کہ وہ یہ بات صرف تسلّی دینے کی خاطر کر رہے ہیں لیکن میں چپ رہی۔ شام کو ہاشم صاحب دفتر سے گھر آئے تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے روتے ہوئے یہ بات انہیں بتائی کہ بھائی جان سال بھر کے لئے لندن جا رہے ہیں۔

ارے بھئی اس میں رونے کی کیا بات ہے وہ اتنے بڑے عہدے پر جا رہے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ وہاں اپنا علاج اچھی طرح کروا سکیں گے"۔ ہاشم صاحب نے مجھے تسلّی دی۔ یہ بات مجھے اب معلوم ہوئی کہ ہاشم کو بھائی جان کی بیماری کا علم ہو گیا تھا لیکن وہ بھی بھائی جان کی طرح ہم سے چھپاتے رہے۔

اور پھر وہ منحوس گھڑی بھی آ گئی جب میرے بھائی جان لندن جانے کے لئے ایرپورٹ جانے کی تیاری کر رہے تھے میں نے کتنی منتوں اور دعاؤں سے امام ضامن سی کر بھائی جان کو بازو پر باندھا تھا۔ گھر مہمانوں سے اٹا پڑا تھا لاہور سے سردار بھائی جان بھابھی باجی ہنوتی سبھی لوگ آئے ہوئے تھے ہر شخص اُن کے جانے پر غمزدہ نظر آ رہا تھا۔ کراچی ائرپورٹ پر سبھی اہلِ خانہ چپ چاپ بھائی جان کو الوداع کہنے کے لئے کھڑے تھے اور بھائی جان ریاض بھائی کے ساتھ کاغذات وغیرہ کی خانہ پری وغیرہ کے لئے اندر باہر بھاگم دوڑ کر رہے تھے اور پھر وہ سب سے باری باری گلے ملنے لگے سبھی کی آنکھوں میں آنسو تھے بھائی جان خود بھی رنجیدہ تھے لیکن بہت ضبط کئے ہوئے تھے مجھے تو نہ جانے اس وقت اپنے اوپر قابو کیوں نہ رہا میرا دل چاہ رہا تھا میں چیخ چیخ کر

رؤں دل غم سے پھٹا جا رہا تھا بھائی جان نے آخری بار مجھے اپنے ساتھ چمٹایا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

وہ کہتے رہے بھئی ایسی کیا بات ہے اس طرح کیوں رو رہی ہو لیکن مجھ سے ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے مجھے اپنے سے علیحدہ کیا سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور پھر جیب سے بٹوہ نکال کر سو روپے کا نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیا یہ لو اس کا تم کچھ اپنے لئے لے لینا۔ وہ اس طرح بولے جیسے میں کوئی ننھی سی بچی ہوں اور وہ اٹھنی چونی دے کر بہلا رہے ہوں اور پھر سو کا نوٹ انہوں نے ہر بہن کے ہاتھ پر رکھا دفتر کے ملازم اور دونوں ڈرائیوروں میں روپے تقسیم کئے اور پھر سب کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلاتے ایئرپورٹ کے اندر چلے گئے اور ہم سب بدنصیب بھائی بہن انہیں ہمیشہ کے لئے رخصت کر کے گھر واپس آ گئے۔

لندن پہنچ کر وہ ہر ہفتے اپنی خیریت کی اطلاع دیتے رہتے تھے ریاض بھائی بھائی جان کے جانے کے بعد بہت اکیلے اکیلے اور اداس دکھائی دیتے تھے اور پھر انہوں نے بھابھی جان اور بچوں کے ساتھ ہی خود بھی لندن جانے کی تیاری شروع کر دی ملک کے حالات بھی ان دنوں الیکشن کے بعد کافی خراب تھے روزانہ کرفیو لگتا تھا۔ اسی دوران بھائی جان نے گھر ہم لوگوں کو فون کیا اور کہا۔

”میں لندن سے باہر جا رہا ہوں پندرہ بیس روز کے لئے تم لوگ اس دوران مجھے نہ خط لکھنا اور نہ ہی فون کرنا،“ بھابھی جان سے کہا

”شکیلہ تم اس دوران مری جا کر سب سے مل آؤ۔ طبیعت کا پوچھا تو کہنے لگے ”میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے،“ ہم لوگ اپنی جگہ مطمئن ہو گئے۔ بھابھی جان مری اپنے میکے سب سے ملنے چلی گئیں اور ہمیں یہ خبر نہ تھی کہ بھائی جان چونکہ اپنا آپریشن کروانے کے لئے ہسپتال داخل ہو رہے ہیں اس لئے ہمیں فون کرنے اور خط لکھنے کو منع کیا ہے اور لندن سے باہر جانے کا بہانہ بنایا ہے لندن میں ان کا آپریشن ہوا ڈاکٹروں نے تلی اور اپینڈکس دونوں چیزیں نکال دیں کافی بڑا اور سیریس آپریشن تھا۔ شہاب بھائی، عالی بھائی، گل بھائی اور دوسرے سبھی قریبی دوستوں کو معلوم تھا سب روزانہ ہسپتال فون کر کر کے بھائی جان کی خیریت معلوم کرتے رہتے تھے لیکن بھائی جان نے سب کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ ان کے آپریشن کی گھر میں بہن بھائیوں بیوی بچوں کسی کو خبر نہ ہو ورنہ وہ سب پریشان ہوں گے اور پھر نہ جانے کس طرح ریاض بھائی کے سامنے بھائی جان کے دوست گل حمیدہ صاحب کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ انشا جی کا لندن میں آپریشن ہوا ہے اور وہ ہسپتال میں ہیں اتنا سننا تھا کہ ریاض بھائی کی حالت خراب ہو گئی۔ گل بھائی نے انہیں تسلی دی اور لندن ہسپتال کا نمبر دیا کہ انشاء بالکل ٹھیک ہیں تم کال بک کرا کے خود ہسپتال میں بات کر لو۔ ریاض بھائی نے اسی وقت بھائی جان سے لندن ہسپتال میں بات کی۔ انہوں نے ریاض بھائی کو ہر طرح اپنی طبیعت کے بارے میں اطمینان دلایا اور حیران ہو کر پوچھا کہ تمہیں میرے ہسپتال میں ہونے کی اطلاع کس نے دی اور تم نے ہسپتال کا نمبر کہاں سے لیا ریاض بھائی نے اسی وقت بھائی جان سے کہہ دیا کہ میں دو تین روز میں لندن آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔ گھر میں بھائی جان کے آپریشن کی خبر ہم سب پر بجلی بن کر گری دن رات اُن کی صحت یابی کی دعائیں مانگی جانے لگیں اور تیسرے روز ہی ریاض بھائی بھابھی اور دونوں بچوں کو لیکر لندن روانہ ہو گئے۔ سب کی دعائیں قبول ہو گئیں بھائی جان تیزی سے صحت یاب ہونے لگے۔ ستائیس فروری کو بھائی جان یہاں سے روانہ ہوئے تھے اور بیس جون کو ان کا خط میرے نام آیا جس میں لکھا تھا میری طبیعت ہر طرح سے اچھی ہے۔ اب صرف دوا کھانا رہ گیا ہے یا مہینے میں دو بار ہسپتال جا کر انجکشن لگوانا بچوں کے بارے میں لکھا تھا کہ بچوں کا جی لگ گیا ہے سعدی ہفتہ بھر سے اسکول جانے لگا ہے رومی چہکتا رہتا ہے لال سرخ ہو گیا ہے ریاض بھائی جان کے بارے میں لکھا تھا کہ ریاض کی وجہ سے بڑی رونق ہے اس کا دو ماہ کا ویزا جولائی میں ختم ہونے والا ہے ہماری تو خواہش تھی کہ یہاں تفکرات سے آزاد کچھ دن اور رہ جاتا بہرحال خوش ہے اور آخر میں اپنی اس خواہش کا اظہار ان لفظوں میں کیا تھا کہ خدا کرے تم سب لوگوں کو یہاں آنے اور سیر کرنے کا موقع ملے اور پھر ریاض بھائی جان واپس کراچی آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ بھائی جان اب بالکل ٹھیک ہیں بس علاج ابھی جاری ہے اور پھر انہوں نے آتے ہی اپنے بڑے بیٹے محمود بابر کو بھائی جان کی دیکھ بھال کے لئے لندن بھیج دیا ویزے کی مدت ختم ہوتے پر بابر واپس آیا تو اس نے بتایا کہ اب تو بھائی جان مکمل طور پر صحت یاب ہیں دوائیاں بھی ڈاکٹروں نے بند کر دی ہیں اور پھر خبر ملی کہ بھائی جان دسمبر میں کراچی ملنے کے لئے آ رہے ہیں بقرہ عید سے پہلے ہم سب خوشی خوشی ان کے استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے کہ خبر ملی دسمبر میں نہیں فروری مارچ میں آئیں گے نہ جانے بھائی جان نے اپنا آنے کا ارادہ کیوں بدل دیا تھا ہم سب کی خوشیوں پر جیسے اوس پڑ گئی اور پھر پتہ چلا کہ ریاض بھائی دوبارہ لندن جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ریاض بھائی کو بھائی جان سے والہانہ عشق تھا اور بھائی جان بھی ان کو دل و جان سے چاہتے تھے اور پھر نو محرم کو ریاض بھائی ویزا لینے کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے تھے کہ عالی بھائی جان کے فون سے پتہ چلا کہ بھائی جان کی طبیعت کچھ خراب ہے ریاض بھائی اس دوران اسلام آباد سے لاہور آ چکے تھے انہوں نے یہ خبر لاہور ہی میں سنی اور اُسی وقت دوپہر کی فلائٹ سے وہ کراچی آ گئے بھائی جان کی ذرا سی طبیعت کی خرابی کا سن کر ریاض بھائی برسوں کے بیمار لگ رہے تھے دس محرم کی چھٹی تھی بینک بند تھے ٹکٹ وغیرہ کا انتظام کرنا تھا یہ دن بڑی بے چینی میں گذارا اور پھر اگلے دن تمام انتظامات مکمل کر کے رات کو اپنے بیٹے عامر کے ساتھ لندن کے لئے روانہ ہو گئے جاتے جاتے کہنے لگے میں تو اب اُسی وقت آؤں گا جب بھائی جان کا علاج مکمل ہو جائے گا اور وہ صحت یاب ہو کر میرے ساتھ آنے کے لئے تیار ہوں گے میں اب بھائی جان کو اکیلا چھوڑ کر ہرگز نہیں آؤں گا اور پھر وہ اپنے پیارے بھائی جان کو ساتھ لے کر ہی آئے لیکن کس طرح یہ میں کس دل سے لکھوں۔

گیارہ فروری کی منحوس رات کو آٹھ بجے ہم نے فون پر بھائی جان کی خیریت معلوم کی پتہ چلا ابھی تک

باقی صفحہ ۴۹ پر
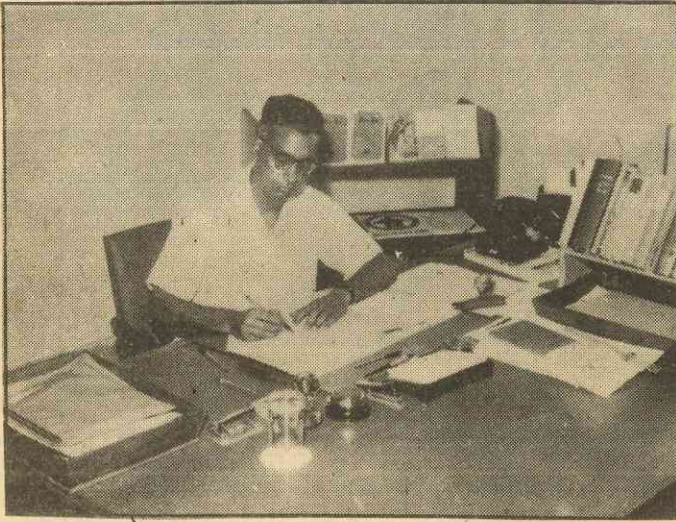
وہ نہ کینسر میں گئے
نہ ہیمرج میں بلکہ انہیں
گریڈ ۱۸ ہو گیا تھا

انشاجی کیا بات بنے گی، ہم لوگوں سے دور ہوئے

ایک مقامی ہفت روزے میں راولپنڈی کی ڈاک کے عنوان کے تحت، ذکر انشا کا اور بیان ممتاز مفتی کا چھپا فیڈرل گورنمنٹ کالج برائے خواتین کی ایم اے اردو کی طالبات نے انشاجی کے جہلم پر اس تعزیتی اجلاس کا اہتمام کیا تھا، صدارت جناب قدرت اللہ شہاب نے کی۔

ممتاز مفتی نے انشاجی کی زندگی کے آخری دور پر روشنی ڈالنی شروع کی اور یہ تکلیف دہ بات بتائی کہ بیمار انشا جب صحت کی طرف بڑھنے لگا اور زندگی کی آس باندھ کر بیٹھا تو اچانک اسے وطن واپسی کا بلاوا آ گیا اور علاج کی سہولتیں منقطع ـ یہ صدمہ ایک حساس بظاہر ہنسوڑ مگر اندر سے کرچی کرچی شاعر برداشت نہ کر سکا اور پھر وہی ہوا جو سب نے دیکھا۔ انشاجی نہ رہے۔

اخباروں میں چھپا، لوگوں کی زبانی سنا کہ

- انشاجی کو کینسر ہو گیا تھا۔
- انشاجی کا کینسر تو ٹھیک ہو گیا۔ اب "برین ہیمرج" ہو گیا تھا:

میں جو مئی ۷۷ء سے جولائی ۷۷ء ڈھائی مہینے ان کے پاس رہ کر آیا ہوں اور اب پھر ۲۳ دسمبر ۷۷ء کو ان کی بیماری کی خبر سن کر لندن پہنچا اور آخری سانس تک ان کے پاس رہا لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں اب میں ان کو کیسے بتاؤں کہ انشاجی نہ کینسر میں گئے نہ برین ہیمرج میں بلکہ انہیں ۱۸ گریڈ ہو گیا تھا۔

انشاجی ۲۰ گریڈ کے تھے اور لندن میں ان کی پوسٹنگ بیماری کے سبب ایمبیسی میں ایجوکیشن ڈویژن میں O-S-D کے طور پر تھی گو عہدہ منسٹر کا تھا لیکن ڈپلومیٹک نہ تھا یعنی سفارتی افسران کو جو سہولتیں ہوتی ہیں ان کو نہ تھیں اور ان کے ذمہ انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں جو نادر و نایاب کتب، مخطوطے اور اہم دستاویز تھیں، جسے انگریز ہندوستان سے غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد اٹھا کر لے گئے تھے ان کی مائیکرو فلمیں منوا کر پاکستان بھجوانا تھا تاکہ وہ ذخیرہ یہاں محفوظ ہو سکے اور اسکالران پر ریسرچ کر سکیں۔

پوسٹنگ کے وقت انہیں اسٹاف کے علاوہ ایک ریسرچ آفیسر مہیا کرنے اور گھر کے کام کے لئے ایک ملازم یا ملازمہ رکھنے کا اختیار بھی دیا گیا تھا لیکن بعد میں ریسرچ آفیسر نہ بھیجا گیا اور انہوں نے گھر کے لئے ملازم بھی نہ منگوایا۔ یہ گھریلو ملازم گورنمنٹ کے اخراجات پر جاتا تھا لیکن وہ تو کسی طور گورنمنٹ کا پیسہ نہیں خرچ کرنا چاہتے تھے۔

ایمبیسی میں منسٹر ابن انشا کو کئی مہینے تک کوئی کمرہ نہ ملا اور وہ کبھی کسی کے کمرے میں بیٹھ، کبھی کسی کے ساتھ بیٹھ، کام کرتے رہتے۔ تقریباً ۵ مہینے بعد انہیں ایک کمرہ ملا اس کمرے کی آرائش کے لئے رقم بھی موجود تھی لیکن انہوں نے کچھ فرنیچر جو دوسروں کے پاس فالتو تھا۔ مانگ لیا اور کچھ فرنیچر جسے ناکارہ سمجھ کر سٹور خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ نکلوا کر اپنے کمرے میں رکھ لیا اسٹاف میں ان کو ایک اسسٹنٹ اور ایک اسٹینو ملے تھے۔ یہ دونوں بھی اسی کمرے میں بیٹھتے تھے۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی کسی دوسرے شعبے کے دو آدمی بھی بیٹھتے تھے ایک ٹائپسٹ لڑکی اور ایک صاحب، انشا صاحب دروازے میں داخل ہو کر انہیں سلام کہہ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔

پاکستان ایمبیسی کے ایک آفیسر خالد حسن جو پرانے

صحافی بھی ہیں۔ ویلی ٹائمز میں انشاء صاحب پر ایک مضمون لکھا ہے اور پاکستان کے کسی جوائنٹ سیکریٹری کا ذکر کیا ہے جس نے ایک ایسا کمرہ لینے سے انکار کر دیا تھا جس کے مین دروازے سے کسی اور آفیسر کے کمرے کو بھی راستہ تھا لیکن انشاء صاحب نے کسی چیز پر اصرار یا اعتراض نہ کیا دراصل وہ تو کام کرنے گئے تھے اور کام کر رہے تھے۔

مائیکرو فلمیں

ابن انشاء نے انڈیا آفیس لائبریری پروجیکٹ پر ایک نوٹ لکھا ہے جو ان کے کاغذات میں سے ملا ہے۔ مائکروفلمیں مہنگی چیز ہے اور دن بدن مہنگی ہوتی جارہی ہیں ان کے لئے گورنمنٹ نے فارن ایکسچینج میں ۲۰۰ء۷ روپے کا پیسے سال میں خرچ کرنے کا اختیار دیا تھا لیکن انشاء صاحب نے انڈیا آفیس لائبریری سے معاملات طے کر کے یہ رقم بھی بچالی اور انڈیا آفیس لائبریری سے طے پاگیا کہ جن چیزوں کی مائکروفلموں کے پیسے یہ کہیں گے وہ بنا کر دیں گے اور یہ ان کے بدلے میں پاکستانی مطبوعات دیں گے اس طرح سے انہوں نے ۲۰۰ء۷ روپے کی فارن ایکسچینج بچادی۔

اس نوٹ میں لکھا ہے کہ بجٹ میں شروع سے ایک ریسرچ آفیسر رکھا گیا تھا۔ لیکن ریسرچ آفیسر مہیا نہیں کیا گیا اور انشاء صاحب انڈیا آفیس لائبریری اور ایمبیسی آفیس دونوں جگہ کام کرتے رہے وہ لکھتے ہیں کہ یہ ان پر ایک زائد بوجھ تھا مگر انہوں نے خوشی سے یہ بھی کیا۔

علاج

کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جہاں انہوں نے گورنمنٹ کی بچت نہ کی ہو لوگ دور دور سے علاج کروانے لندن جاتے ہیں انشاء صاحب گورنمنٹ کے اخراجات پر پرائیوٹ علاج کا حق رکھتے تھے مگر انہوں نے گورنمنٹ کے اخراجات بچانے کی خاطر ایک عام آدمی کے طور پر علاج کروایا، علاج کی بہتر سہولتوں سے فائدہ نہ اٹھایا اور آخری بار گورنمنٹ کے اخراجات بچانے کی خاطر جس اسپتال میں تھے ان کا نام "اٹکنسن اسپتال" تھا۔ اور میں وہاں کے علاج اور ڈاکٹروں کی لاپرواہی سے پریشان تھا۔ پاکستان ایمبیسی کے ایک آفیسر سے میں نے کہا یہاں ایک تو علاج نہیں ہو رہا دوسرے ڈاکٹر بے پناہ لاپرواہ ہیں، میں صبح سے رات تک ان کے پاس رہتا ہوں۔ ہفتے عشرے میں پانچ منٹ کے لئے ڈاکٹر کی شکل دیکھنے کو ملتی ہے آپ اتنا کرم کریں کہ انہیں کسی دوسرے اسپتال میں منتقل کروادیں۔

وہ بولے "اب اس اسٹیج پر یہ مناسب نہیں ہے اسپتال والے ناراض ہو جائیں گے کہ پہلے پرائیوٹ کے طور پر علاج کیوں نہیں کروایا۔

میں نے بہت اصرار کیا مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہے انشاجی کے مرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر ایک اطمینان تھا رنج نہیں ذرا رنج و غم نہ تھا بلکہ ان کا چہرہ بہت پرسکون تھا جیسے ٹھنڈک پڑ گئی ہو۔

واپسی کے لئے ۵ دن

جناب ابن انشاء نے جو نوٹ انڈیا آفیس لائبریری پروجیکٹ کے بارے میں لکھا ہے اس میں لکھا ہے کہ ۲۵ نومبر ۱۹۷۷ء کو آرڈر موصول ہوتے ہیں کہ OSD کی پوسٹ ختم کردی گئی ہے اور ابن انشاء کو واپسی کے لئے صرف پانچ دن دیئے گئے ہیں ساتھ ہی مکان خالی کرنے کا نوٹس بھی۔ ابن انشاء یہ صدمہ نہ سہہ سکے خاص طور پر اس لئے کہ ابھی ان کے چیک اپ کے تین مہینے باقی تھے اور وہ ۱۸ مارچ تک وہاں رہنا چاہتے تھے اس صدمے کے لئے وہ یوں بھی تیار نہ تھے۔ کہ آغا ہلالی جو اکانومی ٹیم کے ہیڈ تھے انہوں نے ابن انشاء سے مل کر پوری معلومات لیں اور کام کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد کہا

"مسٹر انشاء آپ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔"

بس وہ چاہتے تھے کہ چونکہ یہ کام بہت سال لے گا اس لئے اسٹاف میں کمی کردی جائے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس اہم پروجیکٹ کی ضرورت کے بارے میں انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن یہاں تو کسی کا ۱۸ گریڈیے کا بھانجہ بھتیجہ رشتے دار یا سفارشی منتظر تھا، چنانچہ ان کی واپسی کے آرڈر کر دیئے گئے اور اخبارات میں جو خبر چھپی وہ یہی تھی کہ اخراجات کم کرنے کی خاطر ۱۸ گریڈ کے آدمی کو وہاں بھیجا جائے گا۔

اگر میری ضرورت نہیں

جناب آغا ہلالی نے اس پروجیکٹ کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام ضرور ہونا چاہیئے اگر کسی وجہ سے مجھے رکھنا مقصود نہ ہو تو میری بجائے ایک سینئر سکالر یونیورسٹی کا پروفیسر میرے ہی گریڈ میں بھیجا جائے کیونکہ اگر اس سے کم اسکیل اور اہلیت کا آدمی بھیجا گیا تو کم قابلیت کی بنا پر یہ پورے کا پورا نقصان ہی ہوگا اور پھر میری واپسی اور اس شخص کے آنے پر جو اخراجات ہوں گے ان سے کسی قسم کی بچت بھی نہیں ہوگی۔

اس پروجیکٹ کی ضرورت

اس پروجیکٹ کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ ... ایک مہم چلی تھی کہ یہ لائبریری اور اس کا ریکارڈ ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کیا جائے اور قباحتیں بھی پیدا ہو گئی تھیں کہ کسے کیا ملے جب کہ ایک دعویدار اور بنگلہ دیش بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اب ایک طرف یہ صورت تھی کہ اس نقصان پر افسوس کرتے رہتے دوسری صورت یہ تھی کہ اس سلسلے میں کچھ کیا جائے ہماری حکومت نے بخوشی یہ حقیقت پسندانہ اقدام کیا کہ لندن میں ایک اسپیشل آفیس کھولا اور ۱۹۷۳ء میں جناب قدرت اللہ شہاب کے چارج میں دے دیا جناب قدرت اللہ شہاب ۲۲ گریڈ کے تھے تاکہ ان دستاویز کے اور مخطوطات کی مائکروفلمیں نیشنل لائبریری یا ان جگہوں پر جہاں قدیم تاریخی دستاویز رکھی جاتی ہیں رکھی جا سکیں جناب قدرت اللہ شہاب نے کچھ اہم دستاویز کی مائکروفلمیں بنوائیں لیکن انہیں بعض وجوہ کی بنا پر ایک ہی سال میں واپس آنا پڑا اور اس طرح یہ کام ۱۹۷۷ء تک التوا میں پڑا رہا

اس اثنا میں نیشنل لائبریری آف پاکستان جس کی بلڈنگ اسلام آباد میں تکمیل کے قریب ہے اور یونیورسٹیز اور سکالرز نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ اس کام کو دوبارہ شروع ہونا چاہیئے اس کی بنا پر مارچ ۱۹۷۷ء میں مجھے اسپیشل آفیس لندن کے انچارج آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی (O.S.D) کے طور پر بھیجا گیا۔

انڈیا آفس لائبریری میں خزانہ

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

جب علامہ اقبال نے مندرجہ بالا شعر کہا تو ان کے ذہن میں انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں کتابوں کا وسیع خزانہ تھا اور اس میں بھی خاص طور پر انڈیا آفس لائبریری کی کتابیں۔

ان کتابوں میں پہلا اور ضروری خزانہ ٹیپو سلطان شہید کے ۲۰۰۰ مخطوطات اور دستاویز ہیں اور دوسرا ضروری ذخیرہ مغلوں کی لائبریریاں تھیں۔ مغلوں کے زمانے کے بہت سے ذخیرے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں یہاں پہنچے، ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) مسودے انگریز کے ہاتھ لگے جن میں کچھ یہاں موجود ہیں۔ دہلی کالج کی لائبریری بھی لوٹ کے مال کے طور پر شامل ہے۔

ایک بہت بڑا ذخیرہ عربی، فارسی، اردو اور دوسری پاکستانی زبانوں کا نیلام میں خرید کردہ یا کسی اور طریقوں سے حاصل کردہ بھی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔

رن کچھ اور افغانستان

اس کے علاوہ بھی ہزاروں مطبوعات اور اہم دستاویز ہندوستان میں تحریک پاکستان کے بارے میں سیاسی اور ثقافتی نوعیت کی ہیں جو ہمارے ملک میں موجود نہیں ہیں مگر انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں ہمیں رن کچھ کی مہم اور افغانستان کے بورڈر کے جھگڑے کے وقت ان کی ضرورت تھی۔

تعداد کتب

صرف کتابوں اور دستاویز کی صورت حال یہ ہے کہ انڈیا آفس لائبریری میں ان کی تعداد تین لاکھ ہے جن میں سے دو لاکھ اسلامی زبانوں عربی، فارسی ترکی، اردو، پنجابی، پشتو، سندھی اور بلوچی میں ہیں۔

ان میں بہت ساری خاص طور پر تاریخی کتب نادر و نایاب ہیں اور ہمارے نقطہ نگاہ سے بہت ضروری بھی ہیں۔ ہمیں یقینی طور پر پاکستانی زبانوں کے ذخیرہ اور عربی اور فارسی کے ذخیرے کو فوقیت دینی ہے اور بہت ساری انگریزی کی کتابیں اور دستاویز بھی بے حد اہمیت کی حامل ہیں اسپیشل آفیس کی کارکردگی کی رپورٹ، وقتاً فوقتاً منسٹری آف ایجوکیشن کو بھجوائی جاتی رہی ایجوکیشن کے سکریٹری اور جناب قدرت اللہ شہاب نے ستمبر ۱۹۷۷ء میں لندن پہنچ کر معائنہ کیا اور لکھا:-

(۱) اسپیشل آفیس کی کارکردگی پچھلے چند مہینوں میں بہت تسلی بخش رہی۔

(۲) ابن انشاء نے جو معاہدہ تجویز کیا ہے اس سے فارن ایکسچینج میں بچت ہوگی اور پروجیکٹ بہتر طور پر ہو سکے گا۔

(۳) یہ وقت ہے کہ مسٹر انشاء کو ایک ریسرچ آفیسر دیا جائے تاکہ ان کے ہاتھ اس سلسلے میں زیادہ مضبوط ہو سکیں اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ اسپیشل آفیس کے کام کو اور بڑھایا جائے تاکہ برٹش میوزیم اور دوسری لائبریریوں کا جائزہ بھی لیا جا سکے اور مجھ سے کہا گیا کہ اس معاملے میں ایک خاکہ تیار کروں۔

دوستی

۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ میں جنگ اخبار کے دفتر میں شوکت تھانوی کے پاس بیٹھا تھا کہ مشہور افسانہ نگار غلام عباس آ گئے۔ شوکت تھانوی نے ان سے میرا تعارف کروایا۔

"یہ محمود ریاض ہیں ابن انشاء کے بھائی"۔

وہ بڑی محبت سے ملے اور کہا کہ ابن انشاء تو ہمارے دوست ہیں۔

شوکت تھانوی نے ہنس کر کہا۔

"یہ بتایئے کہ وہ کس کے دوست نہیں ہیں"۔

اور واقعی ساری عمر ہم نے جس کو دیکھا ان کا دوست دیکھا، جو ان کے دوست نہیں تھے وہ بھی ان کا احترام کرتے تھے برائی کرنے والا کوئی نہ دیکھا اور خود ان کے منہ سے بھی نہ سنا کہ فلاں برا ہے لیکن لندن میں پوسٹنگ کے وقت ان کا برا چاہنے والے پاکستان اور لندن دونوں جگہ پیدا ہو گئے اور وہ کچھ لوگوں کی آنکھ کا شہتیر بن گئے جس کا ثبوت ان کے اس انداز میں واپسی اور مکان خالی کرنے کے نوٹس بھی شامل ہیں جس میں نہایت پھرتی اور چابکدستی دکھائی گئی۔ ایسی صورت میں اکثر لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے لیکن جلنے والے بھی موجود تھے۔ ایمبیسڈر جناب نسیم مرزا کے چہرے پر غم اور اداسی چھائی ہوئی تھی لیکن بعض چہروں پر سکون اور اطمینان کی جھلک تھی۔

چیف مارشل لا جنرل ضیاء الحق تعزیت کے لئے تشریف لائے تو کچھ نوٹس اور خطوط جو انشاء صاحب کو دیئے گئے تھے جنرل صاحب کو دکھائے تو ان کی

باقی صفحہ ۴۹ پر

انشاجی

روشنی کی تلاش میں اندھیرے میں جا بسے

انشا جی اٹھو اب کوچ کرو
اس شہر میں جی کا لگانا کیا

انشاجی کوچ کر گئے۔ کبھی تو وہ ملکوں ملکوں جاتے تھے اور اب وہ قیامت تک کے لئے آسمان پر کوچ کر گئے ایک اتنا بڑا عظیم انسان کوچ کر گیا جو ایک بہترین دوست اور مخلص انسان تھا۔ بلکہ یوں کہئے وہ انسان نہیں فرشتہ تھا

انشاجی ایک مسافر تھے جو روشنی کی تلاش کرتے کرتے اندھیرے میں جا بسے۔ یہ ایک فنکار تھے جو صرف حلال کی کمائی پر بسر کرتے تھے۔ انشاجی مرے نہیں ہیں بلکہ زندہ ہیں۔ وہ زندہ ہیں اُن کی روح زندہ ہے جو ہمارے ساتھ ساتھ سائے کی مانند چل رہی ہے۔ زندہ انسان کبھی نہیں مرتے۔ اُن کی ایک نظم جو انہوں نے ٹوکیو میں لکھی تھی۔ وہ تھوڑی سی یہ ہے

اب عمر کی نقدی ختم ہوئی
اب ہم کو ادھار کی حاجت ہے
ہے کوئی جو ساہوکار بنے
ہے کوئی جو دیون ہار بنے
کچھ سال مہینے دن لوگو
پر سود بیاج کے بن لوگو
ہاں اپنی جاں کے خزانے سے
ہاں عمر کے توشہ خانے سے

یہ اتنی سادہ اور اتنی گہری نظم ہے کہ اسے پڑھ کر آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں۔ طنز و مزاح میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ انشاجی لندن سے اپنے وطن واپس آئے بھی تو ہم سے روٹھ کر آئے۔ انہوں نے سب سے منہ موڑ لیا۔ پتہ نہیں ہم سے کیا خطا ہوئی تھی۔ اُن کی میت سامنے زمین پر پڑی تھی، وہ سو رہے تھے، گہری نیند سو رہے تھے۔ ہم نے انہیں پکارا بھی لیکن انہوں نے آنکھ تک کھول کر نہیں دیکھا۔ کہ ہم خون کے آنسو رو رہے ہیں، وہ اس تابوت میں بند ہم سے کہیں دور تھے۔ جنازہ اٹھا اور پھر منوں مٹی میں دفن ہو گیا۔ ہم انہیں چھو بھی نہ سکے بلکہ آنکھوں سے ایک نظر دیکھ کر خون کے آنسو رو دیئے۔ کسی کو اپنا ہوش نہیں تھا ۔۔!

انشاجی جب پاکستان سے لندن روانہ ہو رہے تھے تو ہمیں کیا معلوم تھا کہ اب جب ملاقات ہوگی تو ایک بیجان سے ہوگی۔ جو چپ ہے بالکل چپ ہے۔ خدا سے بہت دعا کی لیکن وقت جو مقرر ہو وہ آ کر ہی رہے گا۔ ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔

انشاجی کی جو سب سے بڑی خوبی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اپنے اندر کے درد کو کبھی ظاہر نہیں کرتے بلکہ اُس درد کو وہ "اندر ہی اندر سہہ لیتے تھے" اور وہ اُس درد کو چھپا کر اپنے چہرے سے کبھی ظاہر نہ ہونے دیتے تھے۔ اس عظیم انسان کی شان دیکھیں کہ اُس نے اپنے درد کو چھپا لیا اور دوسروں کے درد میں شریک ہو گیا۔ یہ بات وضاحت سے نہیں کہی جا سکتی کہ وہ کتنے ہی گھرانوں کا پیٹ پالتے تھے' جو لاچار اور غریب تھے۔ اُن کو انشاجی ہر مہینے پیسے دیتے تھے جو کہ انہوں نے کبھی ظاہر نہیں کیا کہ غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ اُن کے پاس جو بھی سوالی آیا انہوں نے اس کی خوب مدد کی۔ کبھی کسی سوالی کو خالی ہاتھ نہیں بھیجا۔

میں انشاجی کا بھتیجا ہوں میرا نام تو عمران محمود ہے لیکن انشاجی مجھے پیار سے جوجی میاں کہہ کر پکارتے تھے اور ہم سب انشاجی کو بھائیجان کہہ کر پکارتے تھے لیکن اب کوئی انشاجی نہیں رہے اور اب کوئی بھائیجان نہیں رہے۔ ہمارے دلوں میں زخموں نے جگہ گھیر لی ہے جس میں اب کوئی امید اور کوئی حسرت باقی نہیں ہے۔ پہلے کبھی حسرت ہوتی تھی۔ وہ بھی یہ کہ اللہ انشاجی کو صحت عطا فرمائے۔ لیکن یہ دعائیں ختم ہو گئیں۔ اب ہم کس کیلئے جی رہے ہیں۔ ایک ہنسانے والے نے رُلا دیا۔ اب ہم اُس کو یاد کرتے ہیں۔ یہ کیا ہوا' یہ بہت بُرا ہوا۔ کاش کہ ہم اُن کو چھو سکتے اور اُن سے لپٹ کر خوب رو دیتے۔ مگر وہ تابوت میں بند تھے۔

اس حسن کے سچے موتی کو
دیکھ سکیں پر چھو نہ سکیں

اب میرے کہنے کے لئے رہ ہی کیا گیا ہے، صرف اُن کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کچھ کہہ سکوں۔

انشاجی بہت ہی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ زیادہ تر سوٹ ہی پہنتے تھے۔ رات کو روز پیدل ناشتے کا سامان لینے جاتے تھے۔ کسی کو تکلیف نہیں دیتے تھے۔ میرے ایک بڑے بھائی محمود بابر سے میرے تایا انشاجی بہت محبت کرتے تھے۔ انشاجی بابر کو اپنا بیٹا سمجھتے تھے اور بیٹوں کی طرح پالا تھا۔ اپنے بھائی محمود ریاض سے تو بے پناہ محبت کرتے۔ انہوں نے کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا۔ انشاجی کا صرف یہ معمول تھا۔ صبح وہ دفتر گئے' شام کو واپس آئے اور پھر اپنے کچھ کام کرتے رہے۔ کبھی کوئی سیر و تفریح نہیں کوئی پکچر وغیرہ نہیں۔ نہ کوئی پان کھاتے تھے اور نہ کوئی سگریٹ پیتے تھے۔ انشاجی مرحوم کو ٹی وی پر کارٹون دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ وہ ہر روز قالین پر بیٹھ جاتے

باقی صفحہ ۹۴ پر

ابن انشا کے ایک ہمسفر ایک رفیق حبیب پاسلوی کے قلم سے

شیر محمد قیصر

ابن انشا کے نام سے دنیائے ادب میں لازوال ہو گیا

شاید انشاء جی کا بلاوا تھا کہ میں کافی عرصے بعد کسی ضروری کام کے بنا ہی کراچی آن وارد ہوا بے چین رات ابھی پوری کٹی بھی نہ تھی کہ علی الصبح انشاء جی کے کوچ کی روح فرسا خبر سنی بھی پڑھی بھی۔ اس خبر نے میرے اعصاب کو شل کر دیا۔ وقت کی نبضیں یکایک تھم گئیں۔ گردشِ روزگار رک گئی لمحات ساکت ہو گئے اور میں نے خود کو وسعتِ کائنات میں ڈوبتے ہوئے محسوس کیا۔ ایک بسیط سیاہ چادر نے میرے دل و دماغ کی قوتوں کو ڈھانپ لیا۔ میرے جسم میں ایک جھرجھری سی ہوئی اور پھر بلا اختیار دکھ آنسو بن کر آنکھوں سے چھلک پڑے بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔ سالوں پر محیط گذر رہا دور آنکھوں کے سامنے آ گیا

شورش کاشمیری کی برات انبالے شہر جا رہی ہے باراتیوں میں ادیب۔ شاعر۔ سیاستدان بھی شامل ہیں۔ یہ غالباً ۱۹۴۴ء کا ذکر ہے لدھیانے سے میں حمید اختر اور ساحر لدھیانوی شریک ہوتے ہیں۔ شادی کی رات ہی انبالے میں آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے نکاح سے فراغت پاتے ہی شعراء اور باراتی مشاعرے کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ ایک وسیع پنڈال میں مشاعرہ شروع ہے میں اور حمید اختر ابھی پنڈال سے باہر دوستوں سے مل رہے ہیں کہ ایک نوجوان جھینپتا ہوا ہمارے قریب آتا ہے، حمید اختر تعارف کراتے ہیں ان سے ملیئے شیر محمد قیصر اور میں نہایت محبت سے اپنا ہاتھ بڑھا کر ان سے متعارف ہوتا ہوں اور مزاحاً پوچھتا ہوں کہ آپ بھی شاعر ہیں اور وہ نگاہیں نیچی کر کے گویا ہوتے ہیں کوشش کر رہا ہوں، شاید کبھی بن جاؤں'

یہی نوجوان شیر محمد قیصر بعد میں ابن انشاء بن کر دنیائے شعر و ادب کا لازوال کردار بن گیا۔

یہ انشاء سے میری پہلی ملاقات تھی۔ انشاء نے مجھے اور حمید اختر کو اپنے ہاں چلنے پر اصرار کیا ہم انکار نہ کر سکے انشاء جی کے ساتھ چل پڑے انشاء ان دنوں

انبالہ چھاؤنی میں رہائش پذیر تھے اور بالکل تنہا تھے میں نے نوٹ کیا انشاء جی بہت کم گو ہیں۔ باتیں سنتے زیادہ ہیں بولتے کم ہیں سنے تلے لہجے میں بات کرتے ہیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا میں نے پوچھا "اتنا بڑا مشاعرہ اور آپ اپنا کلام نہ سنائیں یہ کیا تک ہے؟"

کہنے لگے "مجھے مشاعروں کی ہاؤ ہو سے خوف آتا ہے میں واہ واہ کے ڈونگروں سے گھبراتا ہوں"

میرے اصرار پر انشاء جی نے کچھ اشعار سنائے میں نے یہ جان لیا کہ شیر محمد قیصر مشاعروں والا شاعر نہیں بلکہ سچ مچ کا ہمہ گیر قسم کا گہرا شاعر ہے جس کے اشعار میں زندگی ہے جان ہے تنوع ہے اور گہرائی ہے۔ بارات کی واپسی کے بعد میں اور حمید اختر دو دن مزید رکے چند روز کی رفاقت نے مجھے انشاء جی کے بہت قریب کر دیا۔ اور میں اسے برسوں کا ساتھی سمجھنے لگا۔ واپسی پر انشاء ہمیں گاڑی پر سوار کرانے کے لئے ریلوے اسٹیشن تک آئے۔ گاڑی کے انتظار میں ریلوے بک سٹال پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے انشاء نے ایک کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہا جی چاہتا ہے کہ سرورق کی یہ تصویر بک سیلر کی آنکھ بچا کر چرا لوں اور جیب میں چھپا لوں"

میں نے کہا "تم یہ خوبصورت جرم کر ڈالو تو بہتر ہے

کہنے لگے چرا تو لوں مگر جیب میں ڈالنے سے تصویر کے مجروح ہونے کا خدشہ ہے۔ اسی لئے گذشتہ کئی مہینوں سے اس تصویر کو ایک نظر دیکھ جاتا ہوں"

انشاء جی ان دنوں انبالہ چھاؤنی کی کسی فوجی یونٹ کی اکاؤنٹ برانچ میں ملازم تھے اور بوجوہ کتاب خرید نہیں سکتے تھے۔ گاڑی آئی انشاء نے ہمیں سوار کرایا اور تا حدِ نظر ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کرتے رہے۔

اس ملاقات نے انشاء کو میرے دل کے گھروندے میں ہمیشہ کے لئے نظر بند کر دیا اور انشاء جی بھی مجھے اپنا دوست کہنے لگے انشاء جی کے محبت بھرے خطوط میرے نام آتے۔ میں بھی انہیں پیار سے خط لکھتا رہا انشاء جی کے خطوط ادب کا شاہکار ہوتے ان کی چٹخارے دار زبان پڑھتا تو جواب میں لکھتا۔ انشاء جی شاعری اگر چھوڑ دو نثر کی طرف توجہ دو۔ مگر وہ ملازمت کی وجہ سے اپنے دل کی بھڑاس نثر میں نکالنے سے معذور تھے پھر ملک تقسیم ہو گیا میرا سب کچھ اس بٹوارے کی نذر ہو گیا۔

تم بزنس مینوں پر فرض ہے کہ ملک پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں کو آئس کریم کھلاؤ

اور یہ خطوط بھی بری طرح بکھر گئے۔ حالات نے مجھے ملتان لا پھینکا۔ حمید اختر، ۴۷ء کے فسادات سے کچھ عرصہ قبل بمبئی سے لدھیانہ آگیا تھا۔ چند روز کے قیام کے بعد اپنی بہنوں اور عزیزوں سے ملنے اپنے آبائی گاؤں تہاڑہ چلا گیا اور پھر وہیں پھنس گیا تاکہ ہندوستان کے باسیوں نے جو جو ہولناک اور انسانیت سوز مظالم اپنے بھائی بندوں پر ڈھائے ہیں اپنی آنکھ سے دیکھے۔ میں ملتان سے لاہور جاتا حمید اختر ابن انشاء اور دیگر احباب کو ڈھونڈتا وہ ایک عجیب افراتفری کا زمانہ تھا سب لوگ اپنوں کی تلاش میں سپیشل ٹرینیں دیکھتے اور اکثر مایوس ہو کر واپس لوٹ جاتے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوتا ایک روز ماہنامہ "سویرا" کے دفتر میں ساحر لدھیانوی سے ملاقات ہو گئی تو پتہ چلا ابن انشا لاہور پہنچ چکا ہے اور لکشمی چوک کے قریب ایک شرنارتھی کے مکان میں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے اور حمید اختر بھی لاپتہ ہے۔ میں نے انشاء کو پھر سے پالیا۔ ملاقاتوں کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جڑ گیا میں انشاء کو ملنے اکثر لاہور جاتا ہم دونوں عموماً فلم کا آخری شو دیکھتے اور دنیا جہاں کی باتیں کرتے انشاء کا چھوٹا بھائی ریاض محمود غالباً ان دنوں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا اس نے بھی انشاء کے نقشِ قدم پہ لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور انشا نے یہ مجھے بڑے فخر سے بتایا تھا۔

ان دنوں ترقی پسند مصنفین کا بڑا چرچا تھا معیاری ادبی جریدے شائع ہوتے تھے۔ آج کل کی طرح ڈائجسٹ ٹائپ کا لٹریچر مفقود تھا ادب برائے زندگی کا شہرہ تھا ادیبوں شاعروں بلکہ ایڈیٹروں تک کو معاوضہ باقاعدگی سے نہ ملتا تھا مگر ادیب شاعر اپنی قومی اور ملّی ذمہ داریاں بخوبی نبھاتے تھے۔ انشاء جی نے اس کڑے دور میں بھی خودداری اور دیانت کی مشعل کو روشن رکھا۔ اس زمانے کے حکمرانوں کو اہلِ قلم حضرات کو خریدنے کی اہمیّت بھی نہیں تھی۔

لکشمی چوک کے ہوٹلوں میں سرِ شام محفلیں جمتیں جن میں ابنِ انشاء، محترم احمد ندیم قاسمی، حمید اختر (جو خون کے دریا پار کر کے لاہور پہنچ چکا تھا) ظہیر کاشمیری احمد راہی۔ عبداللہ ملک۔ قتیل شفائی، اے حمید اور بہت سے نئے لکھنے والے جمع ہوتے۔ میں بھی ملتان کی افسردہ زندگی سے بھاگ کر ان محفلوں میں شریک ہوتا شاعر و ادیب مفلوک الحال تو ہوتے ہی ہیں مگر ان دنوں مفلوک الحالی کچھ زیادہ ہی زوروں پر تھی۔ سب لوگ اپنی اپنی جیبوں سے ریزگاری نکال کر میز پہ ڈھیر کر دیتے پھر سب مل کر چائے پیتے۔ ابنِ انشاء نے اس زمانے میں بڑی معرکتہ الآرا نظمیں اور غزلیں کہیں جو بعد میں "چاند نگر" میں شامل ہوئیں۔

ان دنوں "سویرا" کی ادارت ساحر لدھیانوی کے سپرد تھی مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک شمارے میں ساحر نے کشمیر کے اس وقت کے وزیر اعظم شیخ عبداللہ کے ایک دعوت نامہ کا جواب جوان کے نام تھا سویرا میں شائع کر دیا تھا جس پہ بڑی لے دے ہوئی۔ سیاست کی جبیں پہ بل پڑ گئے۔ اور بعد ازاں مسلم لیگی حکومت نے جب ساحر لدھیانوی پہ آزادئ تحریر و تقریر کی راہیں بند کرنے کی سعی کی تو ساحر کو مجبوراً لاہور چھوڑ کر بمبئی سدھارنا پڑا۔ انشاء جی اپنی نئی ملازمت کا بوجھ اٹھانے کراچی چلے گئے۔ احمد ندیم قاسمی۔ حمید اختر۔ ظہیر کاشمیری، دادا فیروز الدین" منصور، ظہیر بابر اور حمید ہاشمی جیلوں اور قلعہ لاہور میں بند کر دیئے گئے۔ تو محفلیں لٹ گئیں اور اب لاہور پھر میرے لئے ویران ہو گیا۔

میں جب کراچی جاتا انشاء جی سے ملاقاتیں ہوتیں بچھڑے ساتھیوں کے تذکرے ہوتے ماضی کی یادیں کھنگالی جاتیں اور ہم شام کو صدر میں آوارگی کرتے الفی کی حسین دکانوں میں سجے ہوئے سامانِ تعیش کو دیکھتے۔ جو ہم دونوں کی دسترس سے باہر ہوتا۔ انشاء جی کو آئس کریم کا بڑا شوق تھا جب بھی کھانے پینے کی بات چلتی تو کہتے آؤ آئس کریم کھائیں اور مذاقاً کہتا "تم بزنس مینوں پر فرض ہے کہ ہم پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں کو آئس کریم کھلاؤ"۔

ان دنوں ہماری یہ سب سے بڑی عیاشی تھی۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ کراچی میں ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس ہوئی تھی جس کے مختلف اجلاسوں کی صدارت مولانا عبدالمجید سالک مرحوم، مولوی عبدالحق مرحوم اور احمد ندیم قاسمی نے کی تھی۔ قاسمی صاحب، حمید اختر، ظہیر بابر، ظہیر کاشمیری اور دوسرے ادیب ماسوائے حسن عابدی اور سبطِ حسن کے سب جیلوں سے باہر آ چکے تھے۔ کانفرنس میں ترقی پسند مصنفین لاہور شاخ کے ڈھیروں ادیب شاعر و نقاد جن میں ابراہیم جلیس مرحوم بھی شامل تھے کراچی کی جس ٹرین میں سوار ہوئے تھے اسی ٹرین میں ملتان شاخ کے دو مندوبین جن میں ڈاکٹر سید مقصود زاہدی صاحب اور راقم الحروف تھا سوار ہوئے تھے کراچی کانفرنس کا بڑا زور شور تھا۔ اس کانفرنس میں شوکت صدیقی، حبیب جالب اور شفیع عقیل سے جو ان دنوں نمکدان میں مجید لاہوری مرحوم کے ساتھ کام کرتے تھے ملاقات ہوئی تھی اور احمد بشیر بھی اسی کانفرنس میں ملا تھا۔ ایوب کرمانی مرحوم اور انشاء نے سرکاری ملازمت میں ہوتے ہوئے بھی سب اجلاسوں میں شرکت کی تھی۔

بعد میں سبطِ حسن صاحب جیل سے رہا ہو کر اور لاہور میں بے روزگاری کے تھپیڑے کھا کر کراچی پہنچ چکے تھے ان دنوں انشاء جی پرانی ملازمت چھوڑ کر تاج سینما کی بلڈنگ سے ملحقہ کتابوں کے دفتر میں ملازم ہو چکے تھے وہ اس نئی ملازمت میں خود کو پہلے کے مقابلہ میں زیادہ آزاد اور بہتر پاتے تھے۔ میرے کراچی پہنچنے پہ انشاء جی سید صاحب کو فون پہ میری آمد کی اطلاع دیتے اور سید صاحب کہتے مجھے فون پہ ملتان کے آموں کی خوشبو آ رہی ہے انشاء کہتے یہ نالائق اب بھی خالی ہاتھ آیا ہے پھر شام کو محفل جمتی اور یاروں کے تذکرے ہوتے۔ پھر انشاء کو نہ جانے کیا سوجھی۔ وہ آمادۂ سفر ہوئے۔ بہانہ اسی کتاب کا تھا جس کے سرِورق پہ خوبصورت تصویر تھی حجاب بھی انشاء کی دسترس سے باہر تھی۔ پھر انشاء جی امریکہ۔ مشرقِ بعید۔ یورپ۔ ایران اور مشرقِ وسطیٰ کے ہو کے رہ گئے۔ انشاء سے رابطہ صرف روزنامہ "جنگ"

کی وساطت سے رہ گیا تھا۔

ایوب خانی دور میں جشن فرید کے سلسلے میں ایک بار انشاء جی سبط حسن اور بہت سے شاعر کراچی سے ملتان آئے ملتان میں دونوں کا قیام مختلف جگہوں پر تھا۔ میں سید صاحب سے ملا میں نے اُن سے شیر محمد قیصر کے متعلق استفسار کیا۔ سید صاحب نے پوچھا بھئی وہ کون ہے میرے بتانے پر انہوں نے شب روز ہوٹل فون کیا اور بولے مجھے شیر محمد قیصر سے ملنا ہے۔ انشاء نے کہا کہ وہ پاسلوی کا بچہ آپ کے پاس پہنچ گیا ہے اور اس نے میرا پیرا نا تخلص تبایا ہے۔"

جشن فرید کی تقریبات تین دن تک چلتی رہیں اور ہماری نجی محفلیں بھی آباد و شاد رہیں۔ اسی دوران مسعود اشعر ایڈیٹر "امروز" ملتان نے دفتر امروز میں ایک مختصری محفل مشاعرہ منعقد کرائی اُس وقت میں نے پہلی مرتبہ انہیں مشاعرے میں پڑھتے سنا اور وہ اسی انداز سے پڑھ رہے تھے جیسے معذرت کا اظہار کر رہے ہوں فی الحقیقت مرحوم جسے مرحوم لکھتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ رہا ہے ذہین فطین، زندگی سے بھرپور کتابوں والے شاعر تھے۔ محض مشاعروں والے مترنم قسم کے شاعر نہیں تھے۔ وہ ایک پختہ کار رموز کائنات کو منکشف کرنے والے عالم باعمل تھے۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بے پناہ ادیب نہایت عظیم انشا پرداز اور سفرناموں کے شہنشاہ تھے۔ وہ ایک ایسا شاعر تھا جو اپنی زندگانی کو جاودانی کر گیا اور ساتھ ہی شعر و ادب کے سرمائے کو ایسا قیمتی ورثہ دے گیا جس پر شعر و ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

یک لخت میرے تصورات کی زنجیر ٹوٹ گئی میں کراچی کی سوگوار فضا میں بیٹھا تھا اور مجھے انشاء جی کے گھر جانا تھا میں جب انشاء جی کے گھر پہنچا شناساؤں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ جمیل الدین عالی سوگوار تھے۔ سردار محمود (انشاء جی کے چھوٹے بھائی) و دوسرے تمام احباب کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور وہ استعجابیہ لہجہ میں ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے کیا انشاء جی واقعی چل بسے ہیں مگر اس کا کوئی جواب نہ دیتا تھا بس منہ پھیر کر آنسو پونچھنے لگ جاتا تھا انشاء جی کا جسم فانی ۱۲ جنوری

کو کراچی پہنچا۔ میں نے دوسروں سے مل کر کانپتے ہاتھوں سے اس کی میت کو پی آئی اے کی ایمبولنس گاڑی سے اتارا انشاء جی بالکل ترو تازہ تھے ایسے بیٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی سہانا سا خواب دیکھ رہے ہوں۔ دل پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی مجھے یہ دنیا فضول سی لگی فانی بے اعتبار دنیا مگر لافانی انشاء جی اسے ایک طنزیہ مسکراہٹ سے چھوڑ کر جا رہا تھا مگر آج الوداع کہتے ہوئے ہاتھ نہ ہلا رہا تھا بس مسکرائے جا رہا تھا۔ لاکھوں ہونٹوں پر مسکراہٹیں دینے والا اب مجھ سے دور دور جا رہا تھا اس کے جنازے کا بار اپنے کندھے پر رکھے میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں اپنی ارتھی خود ہی اپنے کندھوں پر اٹھائے چلا جا رہا ہوں ہم نے انشاء جی کو منوں مٹی

نیچے دفن کر دیا۔ اس کی یادوں کے گلاب ترو تازہ ہیں اس کی مشعل روشن ہے پیچھے سے آنے والے قافلے اس کی پھیلائی ہوئی روشنی میں اپنی منزلیں پالیں گے دنیا ارتقاء پذیر رہے گی ہمیشہ رہی ہے مگر میرا مسافر دوست اب اپنے آخری سفر پر روانہ ہوا ہے نہ جانے اس آخری سفر کا سفرنامہ وہ کب شائع کرے۔

اس کو جب معلوم ہوا تھا کہ ملتان میں میں سرمایہ داروں اور رجعت پسندوں کے گٹھ جوڑ سے ۱۹۷۷ء میں دوبارہ مہاجر ہو گیا ہوں تو اس نے کہا کہ یار اتنے غمگین نہ ہو اس معاشرے میں تو روزانہ لاکھوں کروڑوں لوگ لٹتے ہیں تمہارے دکھ کا مداوا معاشرہ تبدیل کرنے میں ہے تمہارا ایک مکان اجڑنے یا بننے سے کیا ہوگا جب تک ان لیٹروں اور ڈاکوؤں کو نہیں مٹاتے جو ابتدائے آفرینش سے اپنے سے کمزوروں پر ظلم ڈھاتے چلے آ رہے ہیں یونہی ہوتا رہے گا۔ مجھے ڈھارس بندھانے والا میرا دوست ملکوں ملکوں کا بنجارہ چاند نگر کا باسی دور جا چکا ہے اس کا مشن جاری رہے گا کیونکہ قانون قدرت یہی ہے اور اس مشن کی تکمیل میرا ایمان و ایقان ہے۔

○○

انشا جی کے نام دوہے

تاج سعید

۱

بکھر گئی گیتوں کی مالا' روٹھ گیا سنسار
چاند نگر کا شاعر روٹھا' چھن گیا چین قرار
دنیا بھر کی سیر کو نکلا' من میں دھن یہ سمائی
لوٹ کے جوگی گھر جب آیا' رونے لگی خدائی
نظم کی شوبھا چگ چگ پرابت کرنے لگی ہے بین
غزل کی بھاشا کے من کا بھی لٹنے لگا ہے چین
شبدوں کی مالا کیا ٹوٹی؟ سونا ہوا ارداش
کو ملتا کی تانوں میں بھی پڑنے لگی خراش
روئے پتنگ کا ہر ورقا' شعر شعر ہے پیاسا

یادوں کی زنجیر میں یارو سمے کو کس نے باندھا
ملن سمے کی میٹھی یادیں' ہر کوئی یاد کرے!
نین نیر برد کر بگلا' آہیں بھرتا پھرے
اس بستی کے اک کوچے میں شاعر تھا بدنام
چاند نگر کی گوری اُس کو کرتی ہے پرنام
جس کے نین جھروکے میں تھا انشاء کا بسرام
اس سندری کے من میں یارو مچا ہے کہرام
سندر ناری ہیروں روئے' دھرج کون بندھائے
جوگی کے بیراگ کے کارن دھرتی کی تڑپتی جائے

ایک آنسو جانے والے کی یاد میں

محمود خاور

۱۱ تاریخ کی رات ہمارے لئے۔ خاندان کے لئے اور اُن سب لوگوں کے لئے ایک طوفانی رات تھی جو اُردو کی لاٹھی تھامے ہوئے ہیں۔

ہر چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ نہ جانے وقت کو کیا ہوگیا ہے۔

یہ ٹھہر کیوں گیا ہے۔ تیزی سے گذرتا کیوں نہیں ہے مایوسی گناہ ہے۔ مایوس مت ہونا ان لفظوں کی ہیر پھیر میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ ادھر لندن میں میرے والد محمود ریاض اور میرا چھوٹا بھائی عامر محمود عجیب کیفیت کا شکار تھے۔

راتیں جاگ کر اُن کی خدمت کرنے والے۔

سر پر گھنٹوں مالش کرنے والے۔

ہاں جی اور اچھا جی کی گردان کرنے والے محمود ریاض دونوں ہاتھوں کو آپس میں دبائے سامنے بیٹھے ہوئے تھے عامر بھوک کی شدت سے گھبرا کر ہسپتال کی کنٹین میں چند لقمہ زہر مار کرنے گیا ہوا تھا۔

ڈاکٹر آیا۔ وہ ڈاکٹر جسے لوگ مسیحا کہتے ہیں۔

ڈاکٹر اور وہ بھی لندن کا ڈاکٹر جس سے علاج کرانے نہ جانے کن کن کونوں سے نکل کر آتے ہیں۔

اس ڈاکٹر نے۔ زندگی کی تمنا رکھنے والے انشا جی کے گرد پردے کھینچ دیئے۔ پھر اُن میں زندگی کی کرن تلاش کرنے لگا۔

پردے ہٹا دیئے گئے۔

پردوں کے ہٹتے ہی۔ ایک جملہ سنائی دیا۔ ایک ہی جملہ جس نے ہم سب کی زندگی میں اندھیرا کر دیا۔ ایک ہی جملہ اس مسیحا کے منہ سے ادا ہوا۔ اور پھر جیسے ہرے بھرے درخت پر بجلی گری ہو۔

انشا جی کے بھائی کی آنکھوں سے آنسو کی ایک لمبی لکیر بہتی چلی گئی۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے آنسو صاف کئے اور اپنے لڑکے عامر کو بلایا۔ اس طوفان کے آنے کی خبر اس کو بھی دی۔

بیٹا۔ بھائی جان ہم سے روٹھ گئے ہیں"۔ یہ سنتے ہی ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور عامر کی وہ ڈائری کھل گئی جس میں اُس نے آج کی تاریخ کے خانے میں ہسپتال کی کنٹین میں بیٹھ کر لکھا تھا۔

"صبح سے بھائی جان کو سانس لینے میں دقت ہو رہی ہے اور وہ آہستہ آہستہ کراہ رہے ہیں، خاور کا فون آیا تھا۔ شام میرے باہر جانے کے بعد بھائی جان کا سانس اُکھڑنے لگا تھا، کوئی ڈاکٹر موجود نہیں۔ وہ لکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس خانے میں ذرا سی جگہ باقی کیوں رہ گئی ہے اس میں کیا لکھوں، مگر پھر اب اُس کو آگے بڑھانے کے لئے اور اسی خانے کو مکمل کرنے کے لئے اس کو الفاظ مل گئے۔ اُس نے آنسوؤں کے بہتے ہوئے سیلاب کو روک کا آنسو صاف کرتے ہوئے اُس ننھے سے خانے کو پُر کر دیا۔

تقریباً ۱۲-۹ پر بھائیجان ہم سے جدا ہو گئے۔ سب کو اکیلا چھوڑ گئے۔

کیا ہم بھائی جان کو ابھی ساتھ لے جائیں گے؟ اُس نے پوچھا۔

صبح تک یہ ہمارے بھائی جان کو ہسپتال ہی رکھیں گے۔ رات جیسے تیسے کر کے گذری ۱۲ تاریخ ہو گی بھائیجان کو صبح ہسپتال نے لیا۔ مولانا کی مسجد میں غسل دیا۔ لندن میں اُن کے چاہنے والوں نے مسجد میں جا کر نماز جنازہ ادا کی اور پھر۔ بھائیجان اُن کی بیوی اور معصوم بچے۔ بھائی اور بھتیجا ۶ بجے کی فلائٹ سے جانے کے لئے ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ اُس ایئرپورٹ پر جہاں انشا جی خود چل کر جایا کرتے تھے آج دوسروں کی مدد سے پہنچے تھے جہاز اُن کو لے کر وہاں سے اُڑ گیا۔

لندن ٹاٹا۔

۵-۹ پر جہاز پیرس پہنچا۔ یہ وہی پیرس تھا جہاں انشا جی بڑی شان سے جایا کرتے تھے۔ !

ہم لندن سے گرمی کھاتے چلے تھے تو بھاری سوٹ اس خیال سے زیب تن کر لیا تھا کہ پیرس میں ضروری سردی ہو گی۔

ہمارے دوست مرزا شیخ بیگ کو اصرار ہے۔ اب کے تمہیں پیرس کی خزاں دکھائیں گے فلاں جنگل میں

باقی صفحہ ۴۹ پر

تاج سعید کے نام!

برادرم تاج سعید صاحب۔ سلام!

آج صبح صبح آپ کا قند میز پر پڑا پایا۔ جی کو خوش آیا۔ اگرچہ قند سے بھی ہمیں بہت دلچسپی ہے کیونکہ شکرلیوں کی کچھ خصوصیات اس شے میں بتائی جاتی ہیں لیکن اس خوبی کے پیش نظر اسے گلقند کا نام دینا چاہیئے اس لئے بھی کہ این حلوائے خوش است دیگر بیارید" کہہ سکیں

میری یہ کمزوری تو سب جانتے ہیں کہ میں آج تک کبھی اندرونِ شہر یا بیرونِ شہر کسی مشاعرے میں نہیں گیا اور نہ آئندہ جانے کا امکان ہے لہٰذا محض للّٰہ یہ تجویز کرتا ہوں کہ لائل پور کاٹن ملز کی نیظر پر آپ لوگوں کو بھی مشاعروں اور مطارحوں کی طرح ڈالنی چاہیئے۔ اور حق الزحمت اگر چادریں، تولئے اور میز پوشیں ملتے ہیں تو یہاں چینی کی بوریاں اور گڑ کی بھیلیاں ملنی چاہئیں اور یہ بات تو مشہور ہے کہ جاٹ کو گنے کی بجائے گڑ کی بھیلی دینے میں آسانی رہتی ہے پھر چونکہ چینی بلیک مارکیٹ میں بھی مشکل سے دستیاب ہوتی ہے لہٰذا شاعر حضرات تھوڑا دینے کو بہت سمجھیں گے یعنی عقلِ حیوانی سے کام لیں گے۔

ہم سمجھتے تھے ہمیں اچھا پرچہ نکالتے ہیں۔ لیکن آپ نے مردان کے نیشکر" زار سے واقعی اچھا پرچہ نکال ڈالا اور خاصے لوگ جمع کر لئے" سچ ہے ؎

ہر کجا چشمہ بود شیریں۔ مردم و مور و ملخ گرد آیند

اور ملز کی بیشتر ہینی کے مقابلے میں تو چشمے کی شیرینی پانی بھرتی ہے مجھے معلوم نہیں کھوڑے کی کانوں میں کوئی ادیب ہے یا نہیں ورنہ اس جانِ ملاحت سے کہتے کہ بھائی تم قند کے مقابلے میں نمک نکالو۔ پھر ؎

"اُدھر جاتا ہے یا دیکھیں اِدھر پروانہ آتا ہے۔

گنیش فلور ملز والوں کو بھی میں چھٹی لکھ رہا ہوں کہ کوئی مجلّہ نکالیں تا کہ مضمون نگاروں کے آٹے، دال، نمک، چینی اور کپڑے کا خاطر خواہ بندوبست ہو جائے اور فلک کج رفتار کو ان غریبوں سے ہر روز آٹے دال کا بھاؤ نہ پوچھنا پڑے یوں تو آسمان کو بھی آسیا سے تشبیہہ دیتے ہیں لیکن اس چکی" کا پیسا کھاتے کھاتے ہم تنگ آگئے ہیں کوئی ورائٹی ہونی چاہیئے۔

آپ نے پرچہ بہت عمدہ آرٹ پیپر پہ چھاپا ہے یہ اچھا کیا لیکن آپ اور اچھا کرتے اگر اسے قند کے ورقوں پر چھاپتے تاکہ اسے پڑھنے کے بعد فائل بنانے کی بجائے یہ کرتے کہ ایڈیٹوریل بچارا اور چائے میں ڈال لیا شیرینی ذرا کم رہی تو برادرم فارغ بخاری کی غزل بھی ڈال لی اور ادبی مسائل والے مضمون سے تو گھر بھر کا ناشتہ ہو سکتا ہے۔ بہر صورت قند ہے مزے کی چیز اور ایک فائدہ یہ ہے کہ جب آپ ترجمان سرحد میں کسی کو گالی دیتے تھے تو وہ جواباً گالی دیتا تھا۔ یا قرولی بھونکنے کی دھمکیاں دیتا تھا لیکن اب کوئی رقیب گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوگا۔ یہ بھی اچھا ہوا بُرا نہ ہوا۔

دوبارہ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ پریمیئر ملز کے ساتھ ڈسٹلری بھی ہے یوں کیجئے دو پرچے نکالئے شوگر ملز والوں کی طرف سے تو قند ہی۔ ڈسٹلری کے پرچے کی ادارت کے لئے محّی عدم صاحب کو بلا لیجئے۔ افسوس کہ مجھ کم بخت نے کبھی پی ہی نہیں ورنہ اپنے کو دفتر بے معنی قرار دیکر غرقِ مئے ناب اولیٰ کر لیتا۔ لیکن عدم کو مت بلائیے ڈسٹلری میں رہ کر پرچہ نکالنے کی فرصت انہیں کہاں ہوگی۔ پھر یہ بار کسی شیخ یا زاہد پر پڑے گا۔ آپ کو میں جانتا نہیں۔ لہٰذا آپ شیخ یا زاہد ہونے کا گمان کرنا زیادتی ہے تاہم ؎

شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

نیاز مند۔ ابن انشا کراچی

○○

ایک خط حزیں کاشمیری کے نام

برادرم حزیں صاحب

اسلام مسنون

آپ کا خط ملا۔ آپ نے جس محبت سے لکھا ہے اس کے لئے ممنون ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ ہمیشہ مجھے اور میری کچ مچ تحریروں کو قدر اور مہربانی کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں۔ ٹیلی وژن شو پر دیکھ کر آپ پر جو تاثر وارد ہوا وہ بھی میں سمجھ سکتا ہوں۔

سچ یہ ہے کہ زیادہ خرابی ایڈیٹنگ کی ہے کہ میں نے جو کچھ کہا اس میں سے بیشتر کٹ گیا، کاٹ دیا گیا عالی صاحب میرے بے تکلف دوست ہیں۔ لیکن ایک بات وہ بھول جاتے ہیں (اور میں بھی کبھی کبھی ان کے معاملے میں بھول جاتا ہوں) کہ بات ہمارے ڈرائنگ روم میں نہیں ہو رہی بلکہ پبلک میں ہو رہی ہے۔ جو کچھ کہا گیا اس میں نیت نہ ان کی خراب تھی نہ میری لیکن MIS FIRE کر گیا۔ ایسا ہو جاتا ہے آپ کو دل میں ملال نہ لانا چاہیئے۔

سچ یہ ہے کہ عالی صاحب شاعر اچھے ہیں۔ پڑھتے بھی اچھا ہیں۔ بذلہ سنج بھی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی حدِ اعتدال سے گذر جاتے ہیں۔ اصل میں کسی ادیب کی مرتبت صرف اس کی تحریروں کی بنا پر ہوتی ہے۔ تحریر سے باہر ہماری حیثیت اضافی اور غیر متعلق ہے۔ اصل حیثیت کو کوئی شخص تنقید سے بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ شاعری ہماری زندگی ہے۔

؏ "جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹا ہم نے پالا ہے"

اگر کوئی مذاق سے قطع نظر سنجیدگی سے بھی ہمیں شاعر نہ مانے تو بھی ہماری شاعری اور ہمارا شاعر ہونا اپنی جگہ رہتا ہے کووں کے کہنے سے ڈھور نہیں مرجاتے +

آپ کا شعر پسند آیا۔"

باقی صفحہ ۴۹ پر

اردو کی آخری کتاب میں سے

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ بڑا دانشمند، مہربان اور انصاف پسند۔ اس کے زمانے میں ملک نے بہت ترقی کی۔ اور رعایا اس کو بہت پسند کرتی تھی۔ اس بات کی شہادت نہ صرف اس زمانے کے محکمۂ اطلاعات کے کتابچوں اور پریس نوٹوں سے ملتی ہے بلکہ بادشاہ کی خود نوشت سوانح عمری سے بھی۔

شاہ جمجاہ کے زمانے میں ہر طرف آزادی کا دور دورہ تھا لوگ آزاد تھے۔ اخبار آزاد تھے کہ جو چاہے لکھیں، جو چاہیں کہیں۔ بشرطیکہ وہ بادشاہ کی تعریف میں ہو، خلاف نہ ہو۔

پاکستان

حدود اربعہ! پاکستان کے مشرق میں سیٹو ہے۔ مغرب میں سنٹو۔ شمال میں تاشقند اور جنوب میں پانی۔ یعنی جائے مفر کسی طرف نہیں۔

پاکستان کے دو حصے ہیں۔ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان۔ یہ ایک دوسرے سے بڑے فاصلے پہ ہیں۔ کتنے بڑے فاصلے پہ اس کا اندازہ اب ہو رہا ہے۔

فعل مستقبل

جو لوگ آج کا کام کل پہ ٹالتے ہوں ان کے ہر فعل کو فعل مستقبل کہا جاتا ہے۔ میں وہ کروں گا، فعل مستقبل ہی کی مثالیں ہیں۔ الیکشن وغیرہ کے دنوں میں ساری گفتگو عموماً فعل مستقبل کے صیغوں میں ہی ہوتی ہے۔

دائرہ

دائرے چھوٹے بڑے ہر قسم کے ہوتے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قریب قریب سبھی گول ہوتے ہیں

ایک اور عجیب بات ہے کہ ان میں قطر کی لمبائی ہمیشہ نصف قطر سے دگنی ہوتی ہے۔ جیومیٹری میں اس کی کوئی وجہ نہیں لکھی گئی جو کسی نے پرانے زمانے میں فیصلہ کر دیا۔

اب تک چلا آ رہا ہے۔ ایک دائرہ اسلام کا دائرہ کہلاتا ہے۔ پہلے اس میں لوگوں کو داخل کیا کرتے تھے آج کل داخلہ منع ہے۔ صرف خارج کرتے ہیں۔

٥٥

چانڈ نگر کی ایک نظم شنگھائی سے اقتباس

پہلی آواز

ہم کھیتی کو پانی دیویں
ہم کھیتی سے اَن اُپجائیں
پھر کیوں اتنے سنکٹ جھیلیں
بھوک سے چھٹکارا نا پائیں
پورب، پچھم، اتّر دکھن
آگے پیچھے دائیں بائیں
کال کے راچھس چار کوٹ میں
گِدھوں کی صورت منڈلائیں

دوسری آواز

اے ساتھی یہ بات نہ چھیڑو
بات کریں تو جیب کٹائیں

پہلی آواز

ٹک ٹک بیٹھے کب تک لیکن
یہ انیائے دیکھے جائیں
یہ جلّاد حکومت والے
ہمرا بہنیں، ہمرا کھائیں
ہمرے ساتھی ملک بدر ہوں
ہمرے ساتھی جیل میں جائیں
ہمرے نیتا پھانسی لٹکیں
ہمرے نیتا گولی کھائیں

(دونوں آوازیں مل جاتی ہیں، پھر بیسیوں، پھر سینکڑوں)

کل جو ہوا ہے اب نہیں ہوگا
فیکٹریوں سے نکلو آؤ۔
رکشہ موٹرو ریلیں چھوڑو
بسیں گراجوں میں پہنچاؤ
اے دفتر کے بابو نکلو
پوتھی کو دریا میں بہاؤ
پڑھنا لکھنا کل پر چھوڑو
اسکولوں کے لڑکو آؤ
آج یہ بیری جانے نہ پائیں
گھیرا ڈالو ہاتھ دکھاؤ۔
کونگ سونگ کو گولی مارو
چیانگ کو پھانسی پر لٹکاؤ
ماؤ کی فوجیں کتنی دور ہیں
ماؤ کی فوجوں کو بلاؤ۔!
ماؤ کی فوجوں کو بلاؤ۔!

بقیہ :- انشاء کے خطوط

افسوس کہ آج کل میری اپنی توجہ شاعری سے زیادہ نثر کی طرف ہے بہر حال وہ بھی مزاج کا دوسرا رُخ ہے لیکن وہ اخبار میں آتا ہے خصوصاً "جنگ" میں لہذا آپ کی نظر سے نہ گزرتا ہوگا۔ کتابیں بنیں گی تو دیکھے گا۔

اور اب تہ دل سے آپ کے خط اور آپ کے جذبات و خیالات کے شکریے کے ساتھ ابن انشاء

دفورِ فصل گل میں بھی جنون کا ہوش تھا مجھے
مگر یہ کون لے اڑا جو بچ رہی تھیں دھجیاں

بقیہ : ایک آنسو

جائیں گے جہاں شاہ بلوط کے پیڑوں سے پتوں کے گرنے کا سماں عجیب ہوتا ہے۔ وہ خزاں کے اس نظارے کے عاشق ہیں۔ ادھر بہار جی بہار کو دیکھنے کو چاہتا ہے۔ اور اتفاق کیجئے کہ جس ملک کو جاتے ہیں وہاں خزاں ہی سے واسطہ پڑتا ہے۔

پیرس سے وہ کراچی پہنچ گئے۔ اُس جگہ جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے طویل دن گزارے تھے

جا کے پردیس لوٹ آیا ہوں
اور اس راہ سے گزرتا ہوں

آج ہیں۔ یا خاندان کے چند افراد اُن کو لینے نہیں گئے تھے بلکہ ایک ہجوم گیا تھا۔ وہ وہ لوگ تھے جو اُن کو ساری زندگی زندہ دیکھنے کی تمنا لئے ہوئے تھے جو ادب سے عشق کرتے تھے۔ جو انسانیت سے عشق کرتے تھے کتنے ہی چہرے تھے جو سوگوار تھے۔ انہیں لوگوں نے اُن کو اپنے ہاتھوں سے اُس جگہ اتار دیا جہاں ایک دن سب کو جانا ہے۔

آج انشاء جی کو مرحوم لکھتے ہوئے ایک عجیب سا احساس یوں دامنگیر ہے جیسے قلم ایک بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کر رہا ہو۔ بے یقینی کے عالم میں یقین تو آ گیا مگر یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ موت کے جابر و قاہر جھونکوں نے اس عظیم المرتبت شمع کو بجھا کر رکھ دیا جس نے عرصۂ دراز تک ادب کے ایوانوں میں خیرہ چشم کرنے والی روشنی پھیلا کر اُسے رفیع الشان بنا دیا تھا۔

وہ زندگی بھر علم و ادب کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔ ان کے سلجھے ہوئے افکار کی تازگی، اُن کے قلم کی رعنائیاں اردو ادب کا گراں مایہ سرمایہ ہیں انہوں نے ان ادق موضوعات پر قلم اٹھایا تھا جن پر دو سطریں لکھنا بھی مشکل ہے۔ وہ اُن پر قلم برداشتہ اسی طور سے لکھتے چلے گئے ہیں کہ کہیں بھی تحریر کی روانی اور شگفتگی میں فرق نہیں آتا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اک رنگ و نور کا سیلاب ہے جو بہتا چلا جاتا ہے۔

یہ کونسا اخبار ہے؟

یہ روزنامہ ردّی ہے۔

اس کی نظر میں ساری جماعتیں ردّی ہیں۔

سارے نظام ردّی ہیں۔

سارے کام ردّی ہیں۔

سوائے ردّی کے کام کے۔

اس کے مضامین بھی ردّی ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ردّی والوں میں بہت مقبول ہے۔ لوگ منوں کے حساب سے خرید لے جاتے ہیں۔

سیروں کے حساب سے بیچتے ہیں۔

یہ سب سے اچھا اخبار ہے۔

اس کا کاغذ مضبوط ہے۔ اور چکنا ہے۔ اس کے لفافے آسانی سے نہیں پھٹتے۔ چاہے ہلدی ڈالو چاہے نمک دوسرے اخباروں میں تو یہ خوبی بھی نہیں۔

— انشاء جی کے مزاج میں جہاں اُلٹ پھیر، تلازمات اور تمسخر کی گنجائش نہیں، وہاں وہ تلخ ترش سے بھی پاک ہے۔ ان کے موضوع واقعہ یا کردار کا بذاتہ مضحک ہونا چنداں ضرورت نہیں۔ مسائل حاضرہ وغیرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ تلخیٔ دوراں کا گلہ نہیں کرتے۔ یہ اُن کے مزاج کا کرشمہ نہیں تو کیا ہے۔

بچھو کا کاٹا اور سانپ کا کاٹا سوتا ہے۔ انشاء جی کا کاٹا سوتے میں مسکراتا ہے۔

بقیہ :- جوجو میاں

تھے اور کارٹون دیکھتے تھے۔ چارلی چپلن ان کا پسندیدہ اداکار تھا۔ جس زمانے میں چارلی کی پکچر اکثر و بیشتر آتی تھیں تو وہ بہت شوق سے دیکھا کرتے تھے۔

اب صرف یادیں ہی یادیں ہیں۔ باتیں ہی باتیں ہیں۔ ہمارے بھائی جان انشاء جی تو منوں مٹی تلے دفن ہو گئے ہیں۔

انشاء جی کی کچھ کتابیں۔ چاند نگر، اس بستی کے اک کوچے میں، بلو کا بستہ، چلتے ہو تو چین کو چلیے، اردو کی دوسری کتاب، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، قصہ اک کنوارے کا، اور بہت سی کتابیں چھپ گئی ہیں۔ جن میں غزلیں سفرنامے، طنز و مزاح کی بہت بہترین کتابیں ہیں جو اُن کی یادگار ہیں۔

بقیہ :- محمود ریاض

غیرت کا ٹھکانہ نہ تھا انہوں نے فرمایا کہ وہ تو سروس میں تھے پھر یہ نوٹس کس طرح دیئے گئے۔

صدمہ

میرے بھائی کی موت اس شاک کی وجہ سے ہوئی ہمیں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا سوائے اس کے کہ!

آستینوں کے داغ تو دھو لو گے
قاتلو آسماں تو دیکھتا ہے

بقیہ :- میرے بھائی جان

ہوش نہیں آیا دعا کرو ہم سب انیس دن سے بارگاہ الٰہی میں مسجدوں میں گڑگڑا کر بھائی جان کی صحت یابی کے لئے دعائیں کرتے رہے لیکن ہم اتنے گنہگار تھے کہ ہماری کوئی بھی دعا عرش تک نہ پہنچ سکی رات کو دس بجے کے قریب طیبہ بھابھی (عالی صاحب کی بیگم) میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں۔ نادرہ میرا دل بہت گھبرا رہا تھا تم سے انشاء کی باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا اس لئے آ گئی اور پھر ہم ساڑھے بارہ بجے تک بھائی جان کی باتیں کر کر کے آنسو بہاتی رہیں ہمیں کیا خبر تھی کہ اُس ہمارے پیارے بھائی جان سب سے منہ موڑ کر آخری سفر پر روانہ ہو چکے ہیں۔ بھابھی طیبہ گھر جاتے جاتے کہنے لگیں نادرہ انشاء اچھا ہو جائے تو میں تم سب بہنوں کو چوڑیاں اور کنگنے

پہناؤں گی۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد طیبہ بھابھی اور عالی بھائی جان چوڑیوں اور پھولوں کے ہاروں کی بجائے آنسوؤں کے ہار لئے ہمیں ہمارے پیارے بھائی جان کی عمر بھر کی جدائی کی خبر سنانے آگئے اتنا عظیم اتنا پیارا بھائی ہم کہاں سے تلاش کریں کہاں سے ڈھونڈیں دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔

بقیہ :۔ پاک چین دوستی

معمول پر ہیں۔ چین کا خیر سگالی وفد وانگ پنگ نا کی قیادت میں پاکستان سے بھارت گیا۔ وفد کے لیڈر وانگ پنگ نانے بھارتی وزیر اعظم سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی سے ایک گھنٹہ طویل ملاقات میں چینی وفد کے قائد نے چین بھارت تعلقات بہتر کرنے کا مسئلہ اٹھایا۔ ۱۵ مارچ ۱۹۷۸ء کے نیویارک ٹائمز کے مطابق بھارت اور چین اپنے سرحدی تنازعات بات چیت اور پر امن ذرائع سے طے کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں اس مراسلے میں لکھا گیا تھا۔ حالیہ چند ہفتوں میں اعلیٰ سطحی سفارتی رابطوں کے کئی دور ہونے کے بعد چین اور بھارت کے درمیان برسوں کے کشیدہ تعلقات میں اچانک اتنی بہتری ہو گئی جو گزشتہ دو دہائیوں میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ ایشیا کے یہ دو بڑے جو ۱۹۶۲ء کی سرحدی جنگ کے بعد سے ایک دوسرے سے لاتعلق سے ہو گئے تھے۔ مصالحت کی کوشش میں پوری احتیاط برت "رہے ہیں" ان نازک مذاکرات کی روشنی میں بھارت کے وزیر خارجہ اٹل بہاری واجپئی نے چین کے دورے کی دعوت اصولی طور پر قبول کر لی ہے۔ یقیناً یہ صورتِ حال پنگ پانگ سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن پنگ پانگ ہی وزیر اعظم چو این لائی اور صدر رچرڈ نکسن کے درمیان شنگھائی اعلامیے کا محرک بھی تھی (جاری ہے)

بقیہ :۔ مارشل لاء

لذت سے بہرہ ور ہونے پر طبیعت مائل رہتی تھی۔ میں خبروں کو جمع کرنے اور دور کی کوڑی لانے میں بڑی کاوش کیا کرتا تھا۔۔ پھر مارشل لاء لگ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے صحافت کا انداز بدل گیا۔ بس یوں سمجھ لو کہ ساری سوچ اور امنگ جاتی رہی جو حکم ملتا چھاپ دیتے۔ کوئی خبر حکومت کی منشا کے بغیر چھاپتے سے ڈرتے۔ نجی گفتگو کچھ کرتے، اداریے کچھ لکھتے۔ پہلے قلم بے ایمان ہوا، پھر ذہن بے ایمان ہو گیا۔۔۔ پھر دوسرا مارشل لاء لگا۔ اس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اور اب ذہن ایک ایسے چکر میں پڑ گیا ہے کہ ہزار چاہوں بھی تو آزاد نہیں ہوتا۔ اس پرندے کی طرح ہوں جسے برسوں کے بعد پنجرے سے نکال کر باہر تو رکھ دیا گیا ہے مگر وہ اپنے پروں کا استعمال بھول چکا ہے۔ اور جانتے ہو یہ ستم صرف میری ذات تک محدود نہیں۔ نوجوان صحافیوں اور نوعمر رپورٹروں کی ایک پوری ٹیم، جو مجھ سے عمر اور تجربے میں پیچھے ہیں، مجھے اپنا ماڈل بناتے ہوئے ہیں۔ اور جو میں کرتا ہوں وہ اسے روا اور مناسب گردانتے ہیں۔ میری طرف دیکھو، میں اپنی ذات میں شرمندہ رہتا ہوں۔ اور ان سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا کیا کروں، میری رگوں میں مارشل لاء کا زہر اتر چکا ہے تم تو اس سے آزاد ہو۔ مگر یوں لگتا ہے جیسے میری ذہنی نحوست نے ان کے ذہنوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

بقیہ :۔ ایڈیٹر کا صفحہ

شرمساری کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے، جو انہوں نے اس مقدس وطن کے قیام کے وقت اختیار کیا تھا۔ بلکہ ابھی چند ماہ پہلے ایک سرکاری اخبار پاکستان ٹائمز کو انٹرویو دیتے وقت بھی انہوں نے اپنے انہی خیالات کا اظہار کیا۔ اور تحریک پاکستان کے دوران انتہائی اہم کردار ادا کرنے والے اخبار "نوائے وقت" کو بھی ان رہنماؤں۔ مولانا مودودی اور مفتی محمود پر قلم اٹھانا پڑا۔ لیکن نہ جانے کونسی مصلحت اور کون سے مفادات ہیں جس کے تحت نوائے وقت اپنی تمام قدیم پالیسیوں کے برخلاف قیام پاکستان کے ان مخالفین کو نہ صرف برداشت کر رہا ہے۔ بلکہ وہ اس مسلسل جدوجہد میں مصروف ہے کہ وہ پاکستان کے سیاہ و سفید کے مالک بن جائیں۔

میں نے تو مال گاڑی کے ڈبے میں صرف چلچلاتی دھوپ برداشت کی تھی، اپنے ددھیال کے تمام عزیز و اقارب کو شہید ہوتے دیکھا تھا میں نے کوئی زیادہ قربانی نہیں دی۔ لیکن پاکستان کے لئے سب کچھ لٹا دینے والے بھی یہاں موجود ہیں۔ میں ان سب کی طرف دیکھ رہا ہوں اس وقت بھی مرحلہ قیام پاکستان سے مختلف نہیں ہے سامراجی طاقتیں پاکستان کے اسی طرح درپے ہیں۔ پاکستان کی بقاء جمہوریت میں ہے، پاکستان پاکستانیوں کا ہے اس لئے پاکستانیوں کو حق ملنا چاہیئے کہ وہ پاکستان کے لئے جو بہتر سمجھتے ہیں۔ اس کا انتخاب کریں لیکن آج بڑے منظم طریقے سے پاکستانیوں کو ان کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے اور قیام پاکستان کے مخالفین کو ان پر مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، وہ جو پاکستان کو ناپاکستان کہتے تھے۔ پاکستان کی مادر جماعت مسلم لیگ کے رہنماؤں کو مسلمان ہونے پر شک ظاہر کرتے تھے۔ جو ووٹ دینے لینے کو ناجائز قرار دیتے تھے اور جنہوں نے کشمیر کے لئے جہاد کو اس وقت ناجائز قرار دیا تھا۔ جب پاکستان میں انگریز کمانڈر انچیف نے قائد اعظم کے حکم کے باوجود فوج کشمیر بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔ آج ریڈیو پاکستان سے ان لوگوں کی تقریریں سنوائی جا رہی ہیں۔ دائیں اور بائیں کی باقاعدہ صف آرائی کی جا رہی ہے بائیں بازو کے لوگ وہی ہیں جو پاکستان کی سلامتی کے لئے بے خوفی سے سامراج کے خلاف ڈٹے جاتے رہے ہیں دائیں بازو والے ہمیشہ سامراج کے حاشیہ نشین رہے ہیں اس میں کوئی شک ہے نہ شبہ۔ اسلام کا دائیں اور بائیں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ دائیں اور بائیں کی تفریق تو وہاں بھی ہے جہاں اسلام نہیں ہے یہ دائیں اور بائیں کا نہیں۔ قیام پاکستان کے حامیوں اور مخالفوں کا مسئلہ ہے۔ بقائے پاکستان کے لئے کوشش کرنے والوں اور سبوتاژ کرنے والوں کا مسئلہ ہے۔

بڑے شہروں میں

"معیار" کے تقسیم کنندگان

مندرجہ ذیل شہروں میں "معیار" ہمارے ان نیوز ایجنٹ حضرات کے ہاں دستیاب ہے۔ پرچہ گھر پر پہنچانے کا انتظام بھی ہے۔ پرچے کے حصول میں دقت ہوتو ان حضرات سے رابطہ قائم کیجئے۔ مزید دقت ہو تو ہمیں براہ راست لکھئے۔

ہفت روزہ "معیار" پوسٹ بکس ۳۱۹۵، کراچی ۲۹۔

پشاور
بزنس کیپٹی چوک یادگار

کراچی
فاروق نیوز ایجنسیز، ریگل چوک۔

لاہور
خان نیوز ایجنسی
ہسپتال روڈ

راولپنڈی
افضل نیوز ایجنسی
ڈی اے وی کالج روڈ۔

کوئٹہ
میسرز گوشۂ ادب
سرکلر روڈ۔

ملتان
ملک نیوز ایجنسی
ملک پلازہ۔، عظمت واسطی روڈ

لائلپور
محمد اسحاق، نیوز پیپر ایجنٹ
کچہری بازار

حیدرآباد
میسرز سلیمان برادرز
نیوز پیپر ایجنٹ

سکھر
حسینی بک ڈپو
گھنٹہ گھر

میرپور خاص
سندھ کتاب گھر
اسٹیشن چوک

لاڑکانہ
پاکستان بک ڈپو

سیالکوٹ
ملک اینڈ سنز
نیوز پیپر ایجنٹ

سرگودھا
میسرز اسٹینڈرڈ بک سٹال

بہاولپور
کیپٹل نیوز ایجنسی

بدین
غفور نیوز ایجنسی

جہلم
بٹ نیوز ایجنسیز

گوجرانوالہ
ذوالفقار احمد صحرائی
نیوز پیپر ایجنٹ

رحیم یار خان
چوہدری امانت علی
نیوز پیپر ایجنٹ

خیرپور
مکتبہ حیدری
حسینی چوک

بھکر (ضلع میانوالی)
ذاکر حسین نیوز ایجنٹ

گلگت
پیرزادہ محمد حسین شاہ
نیوز پیپر ایجنٹ

ڈیرہ اسماعیلخان
راجہ برادرز
نیوز ایجنٹ

گجرات
نذر نیوز ایجنسی
اقبال گنج

منڈی بہاؤالدین
ملت نیوز ایجنسی

ٹھٹھہ
شمس بک سٹال

مانسہرہ
بلال نیوز ایجنسی

خانیوال
کتب خانہ صدیقیہ
کچہری بازار

ڈیرہ غازیخان
شمیم نیوز ایجنسی

سانگھڑ
ہمدرد لائبریری

جھنگ
شیخ محمد حسین
نیوز ایجنٹ

کیمبل پور
خزینۂ علم و ادب
نیوز پیپر ایجنٹ

ڈڈیال (آزاد کشمیر)
راجہ فضل الرحمٰن
نیوز ایجنٹ

چمن
نشاط نیوز ایجنسی

سامارو (ضلع تھرپارکر)
شوقین نیوز ایجنسی

اسکردو (بلتستان)
رسول جو حسن جو
نیوز پیپر ایجنٹ

اوتھل (ضلع لسبیلہ)
شاہد نیوز ایجنسی

وہاڑی (ملتان)
وہاڑی نیوز ایجنٹ

میرپور (آزاد کشمیر)
اعظم نیوز ایجنسی

ایبٹ آباد
پاکستان نیوز ایجنسی

Weekly **MEYAAR** Karachi

Regd. No. 3052
Tel : 435673

AN ILLUSTRATED WEEKLY OF UNITED PUBLICATIONS LTD.

ابنِ انشاؔ کی یاد میں (اشاعتِ خصوصی)

سرورق یونائیٹڈ پبلی کیشنز (پرنٹنگ ڈویژن) میں چھپا